زبانی نزاع لسانیات کی روشنی میں

لسانیات یعنی زبانوں کا فلسفہ ایک علمی مشغلہ ہے جس کا کام الفاظ کے متعلق تحقیق و تفکر کرنا ہے۔ بظاہر تو یہ ایک خشک مضمون معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقتاً نہایت دلچسپ مصروفیت ہے، تحقیق الفاظ کا ذوق ایک مرتبہ پیدا ہو جائے تو اُس چسکے سے زیادہ قوی ثابت ہوتا ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے :-

"چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی"

علمی نظر سے جب دیکھا جاتا ہے تو الفاظ کے وجود میں آنے اور مفہوم اختیار کرنے کا نقشہ قوموں کے اخلاقیات کا ایک چارٹ اور ان کی زندگی کی تاریخ کا ایک گراف ہوتا ہے، اور الفاظ کے چولا بدلنے کا طریقہ اتنا پرفسوں اور جادو بھرا ہے کہ جسے اس کا مذاق ہو گیا پھر اس کے طلسم میں مبتلا رہنا ہی پسند کرتا ہے۔

ہماری زبان میں فلسفۂ زبان کی طرف جتنی توجہ کی گئی وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ سخندانِ پارس کے بعد حمید اللہ خاں صاحب جمیری کی ایک تالیف ضرور جامع کتاب کہی جا سکتی ہے، لیکن اب وہ بھی حالیہ نہیں رہی۔

اس موقع پر مجھے تحقیق الفاظ کے متعلق کوئی بحث مقصود نہیں، اور حقیقتاً میں لسانیات کا طالب علم بھی نہیں، لیکن طبیعت کو اس موضوع سے لگاؤ ضرور ہے۔ یہاں میں یہ کوشش کرنا چاہتا ہوں کہ لسانیات کے بعض بنیادی اُصول کے تحت اُردو ہندی کی موجودہ چپقلش کو سمجھا جائے۔ کیونکہ میرے خیال کے مطابق اس مسئلہ میں جو بحثیں کی جا رہی ہیں یکسر جذبات پر مبنی ہیں، ان کو علمی اُصول سے کوئی واسطہ نہیں۔ بابائے اُردو (معذرت کے ساتھ) ڈاکٹر عبدالحق کا ایک بسیط مضمون مدینہ کی ۱۳ مارچ سنہ ۳۹ء کی اشاعت میں نکلا ہے۔ آخر مضمون میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ :-

"یہ خیال بار ہا سُننے میں آیا ہے کہ زبان قدرتی چیز ہے اور بنانے سے نہیں بنتی۔ اس دھوکے میں نہ رہیے گا۔ انسانی کوشش بڑی بلا ہے یہ ہر مشکل پر غالب آجاتی ہے۔ وغیرہ"

اس وقت نفس مضمون سے محاکمہ مقصود نہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کے رتبۂ علم و فضل سے ہر شخص یہی توقع کرے گا کہ اُن کی بحث منطقی اور علمی استدلال پیش کرے گی لیکن اس تحریر میں کسی استدلال کی تلاش حیرانی کی تلاش کے ہم معنی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ انسانی کوشش بڑی بلا ہے، لیکن اس کا تعلق جہاں تک ہماری زبان سے ہے، خود ڈاکٹر صاحب اپنی کوشش کو سبد بلا، نہ بنا سکے

اور "جہاز نادبر قانا" قسم کے مصادر کی اختراع خود انجمن ترقی اُردو کی تمام مطبوعات میں بھی روا نہ رکھ سکے۔ مجھ سے زیادہ ڈاکٹر صاحب کو علم ہے کہ یورپ میں ایک بین الاقوامی زبان بنانے کی کوششیں جسے ولاپک اور ایسپرنٹو نام دئے گئے ناکام رہ چکی ہیں اور یورپ والوں کو جو ذرایع حاصل ہیں ان کے باوجود وہ بھی اپنی کوششوں کو "بربلا" نہ بنا سکے۔ آج ہمارے یہاں جو لوگ ایک نئی زبان بنا لینے کی دُھن میں لگے ہوئے ہیں یا وہ جو اس کوشش سے سہمے جا رہے ہیں، یورپ والوں کی ان کوششوں کی تاریخ میں بہت کچھ سامانِ خرد افروزی پائیں گے۔ غرض، زبان کی بحث ایک خالص علمی چیز اور فلسفیانہ بحث ہے لیکن سیاسی مفاد کی خاطر میدانِ سیاست کی فٹ بال بنالی گئی ہے۔

جس زمانے میں ہم آپ جی رہے ہیں وہ تحقیق و تلاش کا زمانہ کہلاتا ہے اور علمی ترقیوں کا یہ زور ہے کہ کوئی بات نہیں جو سائنس نہ بن گئی ہو یا آرٹ نہ کہی جاتی ہو۔ گھڑ دوڑ کا ایک سائنس مرتب ہے اور عریانی کی تصریحات آرٹ کہی جاتی ہیں۔ ایسے زمانے میں اگر ملک کے باشندوں کے درمیان زبان کے باب میں کوئی اختلاف رونما ہو یا نقطۂ نظر بدل جائے تو اُسے علمی حدود کے اندر ہی سمجھنا اور طے ہونا چاہئے۔ لیکن اس کے عوض نظریہ آرہا ہے کہ مذہب کی غلط تعبیریں کرکے مسئلے کو تعصب سے رنگا جا رہا ہے، حقیقی سیاست کو پس پشت ڈال کر سیاسی اغراض کا آلۂ کار بنایا جا رہا ہے۔

انسان اس زندگی کی تلخیاں ہلکی کرنے یا اس کی گتھیاں سلجھانے پر فطرتاً مامور و مجبور ہے کہ اسی میں اس کی راحت و مسرت پوشیدہ ہے اور راحت و مسرت کی تلاش انسانی زندگی کا راز ہے چنانچہ اسوقت تک وہ ان تلخیوں کو ہلکا کرنے یا ان گتھیوں کو سلجھانے کا ایک ہی نسخہ دریافت کر سکا ہے اور وہ حکمت و فلسفے کی نظر ہے۔ فلسفے کی روشنی میں آکر ان تلخیوں کا وجود باقی نہیں رہتا، یہ گتھیاں خود بخود سلجھ جاتی ہیں۔ پھر کس درجہ حیرت کی بات ہے کہ فلاطون و ارسطو کے فلسفے میں اصلاح دینے والے اور فلسفۂ ویدانت کے موجد اُس مسئلہ میں تعصب سے کام لیں جو تعصب کو قبول نہ کرتا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ارادہ کرکے ہم زندگی کے ہر شعبے میں تعصب کو داخل کر سکتے ہیں، لیکن علم کے باب میں ارادہ و کوشش کے باوجود ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ زبان تعصب کی چلنے ہی نہیں دیتی اور کون اہل نظر ہے جو اعتراف نہ کرے گا کہ تعصب تو وہ بری شے ہے جو اشیاء سے ان کی دلکشی چھین لیتا ہے، جو انسان کو انسانیت کے درجے سے گرا دیتا ہے۔

اس موقع پر غور و مطالعے کے لئے دو لفظ پیش کرتا ہوں۔ ڈاڑھی کا مسئلہ مسلمانوں میں مذہبی مسئلہ ہے اور اُسے "خدا کا نور" کہا جاتا ہے۔ پیشانی پر سجدے کے نشان کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ قیامت کے روز چمکتا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں چیزوں کے ساتھ مسلمانوں کے کچھ مذہبی معتقدات وابستہ ہیں۔ لیکن ان کے جو نام قبول کر لئے گئے وہ ٹھیٹ ہندی ہیں یعنی "ڈاڑھی" اور "گھٹا" اور ان لفظوں میں ثقالت کے بھی تمام اجزاء موجود ہیں۔ یہ نکتہ شاید مزید دلچسپی کا باعث ہو کہ لفظ "ساڑھی" میں سے ہم نے اور خود ہندی والوں نے بھی ثقالت کو دور کر دیا ہے اور اب عام طور سے "ساری" بولا اور لکھا جاتا ہے لیکن "ڈاڑھی" اور "گھٹا" جوں کے توں چلے آتے ہیں۔ ان کی ثقالت دور کر دینے کا بھی ہمیں خیال نہ آیا۔ زبان کے تعصب سے بالا ہونے کی

بہت سی شہادتیں مہیا ہو سکتی ہیں الیکن اہل نظر کے لئے یہی ایک مثال کافی ہوگی۔

زبان کے موجودہ اختلاف کا لب لباب یہ ہے کہ حضرات اُردو کو خطرہ ہو گیا ہے کہ رائج اور عوام کی زبان پر چڑھے ہوئے الفاظ بھی نکالے جا کر ان کی جگہ سنسکرت کے نامانوس لفظ رائج کئے جا رہے ہیں۔ اس کی بنا یہ ہے کہ ہندؤں کو مسلمانوں کی ہر چیز سے نفرت ہو گئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری نسلوں کی ذہنیت ہندوانہ ہو جائے گی اور ہمارا کلچر فنا ہو جائے گا دوسری طرف پراچینی سجن کہتے ہیں کہ دیش کو ایک جاتی بننے کے لئے ایک راشٹر بھاشا یعنے لنگوا فرینکا کی ضرورت ہے اور اس میں عوام کی سمجھ کے مطابق دیسی الفاظ کی بہتات ہونا چاہئے اور سنسکرت کے الفاظ زیادہ شامل ہونے چاہئیں تاکہ دوسرے صوبے والوں کے لئے ہندوستانی آسان اور قابل فہم ہو۔

میں ان دلیلوں کے صحیح اور معقول ہونے یا نہ ہونے سے بحث نہ کروں گا، بلکہ میری کوشش یہ ہوگی کہ آیا یہ خطرات اور ضرورتیں لسانیات کی نظر میں بھی معقول و صحیح ہیں یا نہیں، اور علم و زبان کی ترازو میں ان کا کتنا وزن اُترتا ہے؟ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زبان بننے کے نظریے کو سمجھا جائے۔

انگریزی ماہرین زبان میں ٹرینچ کا بڑا مرتبہ ہے۔ لسانیات کی بحثوں میں اُس سے حوالہ ناگزیر ہوتا ہے اور کام نہیں چلتا۔ ٹرینچ سے پہلے لسانیات کی بنیاد اس نظرئے پر تھی کہ دوسری ایجادوں اور صنعتوں کی طرح جن سے انسان نے اپنی زندگی کو بتدریج سنوارا اور اُسے معقول بنایا زبان بھی ایک ایجاد اور صنعت ہے۔ اس کی شرح یوں بھی ہو سکتی ہے کہ انسان نے اس دنیا میں آکر اپنی ضرورت کے مطابق چیزیں ایجاد کیں اور بنائیں، اور پھر ان میں آہستہ آہستہ ترقی دیتا رہا اُسی طرح اُس نے زبان ایجاد کی اور اُس میں ترقی دیتا رہا، شروع میں وہ بے معنی آوازوں سے کام لیتا ہوگا، پھر خاص چیزوں کے لئے خاص آوازیں مقرر ہوئی ہوں گی، کچھ اشاروں سے مدد لی گئی ہوگی (جو وہ آج بھی کرتا رہتا ہے) اور اس طرح ترقی پاتے پاتے زبان انسانی خیالات و محسوسات کے اظہار کا حیرت انگیز ذریعہ بن گئی۔

ٹرینچ کو اس نظرئے میں یہ نقص نظر آیا کہ اُسے مان لینے کے بعد زبان انسانی زندگی کا ایک "اتفاق" (Accident) قرار پاتی ہے۔ کیونکہ دنیا میں ایسی انسانی جماعتوں کا تو وجود ہے جو بہت سے اُن ایجادوں اور صنعتوں سے معرا اور محروم ہیں جو بمقابلہ زبان بہت کم درجے پر ضروری ہیں، لیکن ایسا کوئی گروہ انسانی نہیں پایا گیا جو مدنی ارتقا کی ابتدائی منزلوں میں ہونے کے باوجود کوئی زبان نہ رکھتا ہو اور اُسے استعمال نہ کرتا ہو۔

چنانچہ ٹرینچ نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان کے دور وحشت و حیوانیت میں بھی اس کے اندر حیوانیت سے نکل کر مدنیت کی منزل میں پہونچ جانے کا بیج موجود تھا۔ قدرت نے اگر اس کے اندر یہ استعداد نہ رکھی ہوتی تو یا تو وہ حیوانیت ہی کی منزل میں فنا ہو گیا ہوتا یا اُس سے آگے نہ بڑھ سکتا تھا۔ یعنی انسان انسان نہ بن پاتا۔ اس لئے لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قدرت نے انسان کو زبان بالکل اُسی طرح بخشی جس طرح اُسے عقل عطا کی۔ لفظ ہی عقل ہے اور لفظ کے آئینے میں عقل انسانی اپنی صورت دیکھتی ہے

لفظ اور عقل ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ یونانی زبان میں ان دونوں کے لئے ایک ہی لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ابتدا ہی میں انسان لغت اور قواعد کی کتابیں بغل میں دابے رونما نہیں ہوا، لیکن یہ بھی اتنا ہی صحیح ہے کہ اس کے اندر چیزوں کے نام رکھنے کی قابلیت و صلاحیت موجود تھی اور اس قابلیت و استعداد کا موجود ہونا بھی ہرگز کار آمد نہ ہوتا اگر انسان کے اندر یہ فطرت بھی موجود نہ ہوتی کہ وہ اپنی اُس استعداد کو بر سرِ عمل لے آئے۔

ان دلایل کے بعد ٹرنیچ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ زبان نہ تو تمام تر انسانی ایجاد اور اس کی کوشش کا نتیجہ ہے اور نہ بالکل ایک عطیۂ فطرت ہے۔ زبان کے وجود میں لانے کے اندر انسان اور قدرت، دونوں کی کارفرمائی کو دخل ہے اور یہ بات فہمِ عامہ کے بالکل مطابق ہے۔ معمولی عقل والا بھی جب زبان کے مسئلے پر سوچنے بیٹھے گا تو پہلے اُس کا خیال بچوں کی طرف جائے گا کہ بے معنی آوازوں سے کام لیتے ہیں، پھر شاید وہ بہرے گونگوں کا خیال کرے کہ اشارے ہی ان کی زبان ہیں اور بالآخر وہ اسی نتیجے پر پہونچے گا کہ زبان آپ سے آپ بنتی ہے۔

"ڈاڑھی اور گھٹے" کی مثال سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ انسانی ضرورت کے سامنے نہ تو ان کا ہندی ہونا رکاوٹ ثابت ہوا اور نہ ان کی ثقالت مانع ہوئی۔ اور ٹرنیچ کا نظریہ یہیں سے ثابت ہو جاتا ہے۔

مسئلے کی علمی صورت جب یہ ہو تو ایک ہی زبان کے بولنے والوں میں کسی کا یہ کہنا کہ ہماری زبان مٹائی جا رہی ہے اور کسی کا یہ کہنا کہ تمھیں اپنی بھاشا کو پروان چڑھانے کا حق ہے، نہایت مہمل اور خلافِ عقل بحثیں قرار پاتی ہیں۔ اس حقیقت کو نظر انداز نہ ہونا چاہئے کہ بعض علماء نے صرف دو ہی طاقتوں کو مطلق مانا ہے۔ اس میں ایک تو محبت کا جذبہ ہے جس سے اسوقت ہمیں واسطہ نہیں، دوسری علم کی طاقت ہے جو ہماری اس گفتگو کا محور ہے۔

ظاہر ہے کہ علم کا کوئی مذہب نہیں، ہر چند کہ مذہب کا علم اپنی جگہ پر ہے۔ علم اُس کا ہے جو اُسے حاصل کرے۔ زبان کا بھی ایک علم ہے، زبان اُن کی ہے جو اُسے بولیں۔ آغاز میں جن لوگوں نے چہرے پر "اللہ کے نور" اور پیشانی پر "کوہ نور" کے لئے "ڈاڑھی اور گھٹا" کے لفظ قبول کر لئے وہ بہر حال آج کل کے مسلمانوں سے بہتر مسلمان تھے، اس لئے کہ قرنِ اول سے کئی سو سال قریب تر تھے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کے ذہن میں "ہماری تمھاری" زبان کا کوئی تخیل ہو سکتا تھا۔ اُن کے ذہنوں میں اگر اس خیال کا شائبہ بھی ہوتا تو ہندوستان کی لنگوافرنیکا وجود میں نہ آسکتی تھی۔ بلکہ پرانی کہاوت کے مطابق پانی کے ہوتے ہوئے "آب آب" کہتے مر جاتے۔

اب چونکہ زبان کے بننے میں انسان کا بھی ہاتھ ہے اس لئے زبان کا پھولنا پھلنا اس کے بولنے والوں کی ضرورتوں اور تقاضوں کے تحت ہو گا اور چونکہ زبان کے وجود پذیر ہونے میں قدرت کی کارفرمائی بھی شامل ہے اس لئے جب حالات و اسباب بدلیں گے زبان میں تبدیلی آجانا لازمی بات ہے اور چونکہ یہ کارخانۂ دنیا قایم ہی تغیر پر ہے تو زبان کی تبدیلی کو روک سکنا انسان کی قدرت میں بھی نہیں۔ علم زبان کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ ماہرینِ لسانیات نے یہ کلیہ تسلیم کر لیا ہے کہ تیس سال کی

رت میں زبان کے اندر تبدیلی ہو جاتی ہے۔ الفاظ کے مفاہیم میں کمی بیشی ہوتی ہے، کچھ الفاظ ترک ہو جاتے اور کچھ داخل ہو جاتے ہیں۔

ضرورت اور تقاضے کی گفتگو میں یہ تاریخی حقیقت بصیرت افروز واقعہ ہے کہ سلطان محمود کے عہد کے کچھ سکے حال میں محکمۂ آثار قدیمہ نے برآمد کئے ہیں جن پر کلمہ شریف کا سنسکرت ترجمہ دیوناگری حروف میں ٹھپہ کیا گیا تھا۔ یہ واقعہ اپنی جگہ حیرت کا ہمالیہ ہے، لیکن اس ذکر میں حیرت کے لئے بڑی گنجائش ہے کہ بسم اللہ کا ترجمہ "اویکتیانے" رسول کا "اوتار" اور محمد کا "جینا" کیا گیا ہے۔ بودھ اور جین متوں میں "جینا" معلم اول کا لقب ہے۔ سلطان محمود کے بعد سے سولھویں صدی عیسوی تک مسلم بادشاہوں کے سکوں پر دیوناگری ٹھپہ ہوتی رہی۔ "تغلق عہد میں ایک سکے پر "شری سلطان غیاث الدین" ضرب ہوا۔ اور محمد تغلق کے روپئے پر ایک طرف لکشمی دیوی کی تصویر ضرب ہوئی تھی۔

میں واقعی متجسس ہوں کہ ۹ رمئی ۳۶ء کو جب محکمۂ آثار قدیمہ نے شملہ سے یہ بیان نکالا تو اسے پڑھکر بعض مسلمانوں کی کیا حالت ہوئی ہوگی؟ سلطان محمود کے ساتھ علیہ الرحمۃ کہا گیا ہوگا یا اور کچھ؟ محمد تغلق کو کیا خطاب دیا گیا ہوگا؟ اگر اُس کے عہد کے مسلمانوں کی ذہنیت وہ ہوتی جو آجکل ہے تو ان بادشاہوں کی کیا گت بنی ہوتی؟

ذہنیت کے ہندوانہ ہو جانے اور کلچر مٹ جانے کے متعلق ان چیزوں کے اجزائے ترکیبی کو سمجھ لینا ضروری ہے ورنہ کسی منطقی نتیجے تک نہیں پہونچا جا سکتا۔

اُردو زبان کا جایزہ لیا جاتا ہے تو اس میں تقریباً اسّی فیصدی الفاظ ہندی کے نظر آتے ہیں (افعال سو فیصدی ہیں)، اور قواعد بھی کم و بیش یکساں ہیں۔ زبان اور الفاظ کے متعلق اس کے نکتے کو سمجھ لینا چاہئے الفاظ داخل ہونے کے بعد ذہنیت کو متاثر نہیں کرتے بلکہ ذہن کے اندر ان الفاظ کو قبول کرنے سے پہلے اتنی گنجائش پیدا ہو چکتی ہے۔ مولانا حالی انگریزی ذہنیت کے انسان نہ تھے لیکن انھوں نے بعض انگریزی لفظ استعمال کئے جو آج بالکل غیر ضروری نظر آتے ہیں مگر اسوقت ان کی ذہنیت ان لفظوں کے قبول کے لئے طیار تھی اور اس وقت ان کی ضرورت بھی تھی۔ غرض، یہ اسّی فیصدی ہندی الفاظ ہمارے اسلاف کی ضرورتوں اور تقاضوں نے اختیار کئے اور ان کی اتنی بڑی تعداد ہماری ذہنیت کو ہندوانہ نہ بنا سکی (یہ مفروضہ ہے ورنہ میرا خیال اس کے برعکس ہے)

ظاہر ہے کہ کلچر زبان سے علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ کلچر کی نمایش سب سے پہلے ہماری گفتگو میں ہوتی ہے۔ میں اگر "آپ" کی جگہ "تو" یا "تم"، "کہوں اور "جی" کے بدلے "ہو" یا "ہاں"، بولوں تو یقیناً آپ مجھے شایستہ و مہذب انسان نہ کہیں گے پھر کیا اس صورت حال کو تعجب انگیز نہ کہا جائے گا کہ وہ دو لفظ جن کو میں ہر وقت استعمال کرتا اور اپنی شایستگی کا ثبوت دیتا ہوں ہندی الاصل ہیں؟ کلچر کو سمجھنے کے لئے ہمیں اپنے تہوار اور تقریبوں پر نظر ڈالنا اور ان الفاظ کو دیکھنا چاہئے جو اس وقت بولے جاتے ہیں۔

عام مسلمانوں میں شب برات جو خالص اسلامی تہوار ہے، جس طرح منائی جاتی ہے اُس میں ہندوؤں کی شرادھ و پاکنا گتوں میں زیادہ فرق نہیں، پُرکھوں کو پانی دونوں جگہ دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں بیوی کی صحنک کی رسم بالکل وہی ہے جیسے ہندو عورتیں چوکھ جلاتی ہیں۔ تعزیہ داری کے اندر رام لیلا کی نقل کے بہت سے آثار ملتے ہیں۔ کالا دانہ آتارنا اور ٹوٹکے ٹونے ہندو مسلمانوں میں بالکل یکساں ہیں۔ ہندوؤں میں جس طرح مرض یا آسیب جھاڑا جاتا ہے مسلمان پیر اور صوفی بھی اُسی طرح جھاڑتے ہیں۔ پیدائش سے پہلے، پیدائش کے وقت اور پیدائش کے بعد کی رسمیں دونوں میں مشترک ہیں بچے کا نال یکساں طور پر کاٹا جاتا ہے، دورانِ حمل میں ستوانسا یعنے ساتویں مہینے کی رسم دونوں جگہ ایک ہے، گود بھرائی جاتی ہے۔ پیدائش کے بعد اچھوانی اور سٹورا دونوں گھروں میں بنتا ہے، دونوں کے بچے گھٹی ہی پیتے ہیں اور یہ چیزیں اپنے ناموں سے پہچانی جا سکتی ہیں۔ زچہ کو چھٹی یکساں طور پر نہلائی جاتی ہے اور تارے بھی ایک ہی طرح دکھائے جاتے ہیں۔ شادی کی رسموں میں نسبت یا منگنی، لگن پڑنا یا تاریخ مقرر کرنا، دونوں میں ہوتا ہے۔ شادی کے وقت سہرا اور کنگنا باندھا جاتا ہے، چھڑیاں اور اُبٹن کے گولے مارے جاتے ہیں اور یہ رسمیں دونوں فرقوں کے عوام و خواص میں جاری ہیں۔ شادی کی رخصت کو مسلم عوام بھی "بدا" کہتے اور بہن بیٹی کو "بدائی" دی جاتی ہے۔ برات کی رخصت کے وقت "دودھا بھاتی" کی رسم عام ہے۔ بعض جگہ نام بدل گئے ہیں۔ بیٹی کے گھر کھانے سے دیہاتی مسلمان اب تک پرہیز کرتا ہے۔ موت کی رسموں میں تیسرے دن کی قرآن خوانی کو پھول اور تیجہ ہی کہا جاتا ہے۔ دسواں، بیسواں، چالیسواں اور چھماہی سب ہندی لفظ ہیں۔ موتے کا کھانا مسکینوں کو اسی طرح کھلایا جاتا ہے جیسے برہمن جمائے جاتے ہیں۔ الحاصل، پیدائش، شادی، اور موت کی بیشتر رسمیں مشترک ہیں۔ اب اور طرف بھی نظر ڈالیے۔

مسجد کے گنبد پر وہی کلس نظر آتا ہے جو قریب کے مندر پر دکھائی دیتا ہے۔ وضو کے برتن کو لوٹا یا بدھنا ہی کہا جاتا ہے اور یہ سب ہندی کے لفظ ہیں، کلس تو خالص ہندوؤں کی ایجاد ہے۔ تعزیئے کے اوپر کا حصہ چھتری کہلاتا ہے، حالانکہ ہندوؤں میں چھتری اُس عمارت کو کہتے ہیں جو مردے کے پھولوں پر تعمیر کرائی جاتی ہے، الغرض یہ سب وہ چیزیں پیش کی گئیں جو مسلمانوں کے مذہبی یا نیم مذہبی معاملات سے متعلق ہیں اور تلاش سے اور بھی بہت گنوائی جا سکتی ہیں کلچر کے ذکر میں یہ نکتہ سامنے آجانا اہم ہے کہ ایک قوم کے کلچر میں قدیم قوموں اور بعید ملکوں کے کلچر کی جھلکیں بھی ضرور ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہمارے یہاں مردے کے ساتھ توشے کی رسم اس حد تک ہے کہ ہم تعزیے کے ساتھ بھی توشہ دفن کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ پانچ ہزار سال پرانی رسم ہے اور قدیم مصریوں میں اس رسم کا وجود ملتا ہے ان کا عقیدہ تھا کہ یوم حساب کو جب مردے اُٹھیں گے تو اُنھیں بھوک لگے گی۔

ایک تاریخی حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ ہندوستان کی موسیقی ایک ہے اور یہ موسیقی مسلمانوں سے پہلے دھرپد اور الاپ تک محدود تھی اور عبادت کا ذریعہ تھی۔ مسلمانوں نے اسے سوسائٹی کی چیز بنایا اس میں خیال، ٹپہ، ٹھمری وغیرہ کا اضافہ کیا اور ہر زمانے میں مسلمانوں نے بڑے بڑے باکمال پیدا کئے ہیں۔ مسلمان اسی موسیقی کو صدیوں سے سنتے چلے آرہے ہیں اور آج بھی (میں ان مسلمانوں کو نہیں گنتا جو جاز کی گت پر تھرکنے لگتے ہیں) جدا کلچر کے مدعی بھی اُسی موسیقی سے انبساط حاصل کرتے اور

سر دھنتے ہیں۔ لہذا موسیقی کو اگر کلچر سے کوئی تعلق ہے اور اگر موسیقی کلچر کا کوئی جزو ہوسکتی ہے تو جدا کلچر کے مدعی اس کا کیا جواب رکھتے ہیں کہ ان کے اندر اس موسیقی کا پیدا کردہ جو کلچر ہے اسے کیونکر باطل قرار دیا جائے گا یا کس طرح نکال پھینکا جائے گا؟ ایک موسیقی کے ہوتے ہوئے دنیا کا کوئی ذی ہوش انسان تسلیم نہیں کرسکتا کہ ہندوستان کے ہندو و مسلم کا کلچر جدا ہے۔

ایک دوسری تاریخی حقیقت مہمہ یہ ہے کہ امیر تیمور کے پاس ہندوستان کے مسلم بادشاہوں پر حملہ کرنے کا شرعی حیلہ انکا ہندوؤں سے مماثل ہوجانا ہی تھا اور تیمور کے زہد و تقدس مذہبی کو گوارا نہ تھا کہ مسلمان ہندوؤں میں اسطرح کھپ ملجائیں جسطرح وہ اسوقت شیر و شکر ہوگئے تھے

آج بھی جب جداگانہ کلچر کا اس قدر غوغا ہے انھیں "جدا کلچر" کے مدعیوں کی بیگمات ماتھے کی بندیا لگاکر ان کو جھوٹا ثابت کررہی ہیں اور اگر ان حضرات کے گھر میں "کفر" کی یہ تقلید اتفاقاً نہیں ہوتی تو گورنروں اور وائسرائے کی ہر پارٹی میں مسلم خواتین کے ماتھوں پر یہ سرخ ٹیکا دیکھا جاسکتا ہے۔

بعض نفیس طبع حضرات اُردو سنسکرت کے بعض ثقیل و نامانوس الفاظ سے چڑھ جاتے ہیں اور جو اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں وہ تبسّم خند فرماکر جی خوش کر لیتے ہیں۔ میں ثقیل و نامانوس الفاظ کا حمایتی نہیں، لیکن یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان بزرگوں کو علمی اور عملی طور سے اس معاملے کو سمجھنے کی فرصت نہیں ملتی۔ ورنہ وہ دیکھ لیتے کہ ثقالت کا مدار الفاظ کی اجنبیت پر ہے اور مانوس ہوجانے کے بعد ثقالت از خود باقی نہیں رہتی۔ روزانہ یہ حضرات سیکڑوں الفاظ ایسے بولتے ہیں جو نہایت ثقیل ہیں مگر ان میں ان کو ثقالت دکھائی نہیں دیتی۔ چند الفاظ پیش کرتا ہوں جن کا کوئی صحیح مترادف بھی نہیں۔ رگڑ، گھٹاٹوپ، نٹ کھٹ، جھٹ پٹا، الٹ پلٹ وغیرہ۔ یہ الفاظ ان لفظوں سے کم ثقیل نہیں جن کو آج ثبوت میں لایا جارہا ہے۔ فرق صرف مانوس و نامانوس ہونے کا ہے۔

الفاظ کی ثقالت کے باب میں لسانیات کا یہ مسئلہ ان بزرگوں کے سامنے نہیں کہ تحریری لفظ صرف ایک علامت ہے صوتی لفظ کی لیکن مشہور ماہر لسانیات مسٹر ریچرڈ بجیٹ کا قول ہے کہ اصل لفظ صوتی لفظ بھی نہیں آواز بھی اصل لفظ کی اشارت و علامت ہے اس لئے کہ اصل لفظ تو وہ حرکات ہیں جو ہمارے اعضائے نطق یا مخارج صادر کرتے ہیں اور ان مخارج کے حرکت کرتے وقت ہمارے سانس لینے کا نتیجہ آواز ہے۔ مگر چونکہ ہمارے یہ نظر نہ آنے والے حرکات و اشارات اپنے ثانوی وصف یعنے آواز کے ذریعے سے ایصال یعنے (Comunicate) ہوتے ہیں اس لئے آواز کو ان حرکات کی علامت (Symbol) قرار دے لیا گیا ہے۔

اس اُصول کے تحت جب دیکھا جاتا ہے کہ ہماری زبان ہی ایسی خصوصیت کی مالک ہے کہ اسمیں انسانی حلق سے نکلنے والی ہر آواز کے لئے حرف موجود ہے، اور ہمارے گلے کی ساخت ہر تلفظ کو ادا کرسکتی ہے تو پھر ثقالت پر ناک بھوں چڑھانا فطرت کا منھ چڑھانا معلوم ہوتا ہے۔ الفاظ کی ثقالت پسندیدہ شے نہیں لیکن فطرت نے ہمارے گلے کی اگر بناوٹ ایسی رکھی ہے تو اس سے شرمانا کونسی عقلمندی ہے؟ بلکہ اس خصوصیت سے کام نہ لینا کفران نعمت کہا جاسکتا ہے۔ بہرحال ضرورت کے وقت بھی ،،

اس بات کو فخریہ بھی بیان کرتے ہیں جو میری ناچیز رائے میں بالکل بجا و درست ہے۔ اس ضمن میں "چھپر کھٹ" کا لفظ یاد دلا دینا کافی ہوگا یہ مرکب لفظ ہے اور چھپر اور کھاٹ، دو لفظوں سے بنا ہے۔ اس کے اندر اجزائے ثقل بھی ہیں لیکن اسکے مفہوم میں جو نزاکت و راحت، عشرت و تمول کے معنی پائے جاتے ہیں مفہوم ادا کرنے کے لئے دوسرا لفظ تلاش نہیں کیا جا سکتا۔

کسی زبان میں ایک لفظ کے متعدد معنے اور ایک مفہوم کے لئے متعدد الفاظ ہونا ہی اُس زبان کے تمول کی نشانی ہے اور اس حقیقت پر ہمارے شعراء بہتر اظہار خیال کر سکتے ہیں کہ بعض وقت کسی لفظ کا ایک رکن کم یا زیادہ ہونا کس ذہنی تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ اور بالآخر یا تو خیال ناقص طور پر ادا ہوتا ہے یا اس کا خون ہی کر دینا پڑتا ہے، اور اس صورت میں خود شاعر کا دل خون ہو جاتا ہے۔ لہذا یہ بات زبان کی ضرورت میں داخل ہے کہ اس کے اندر ہم معنی اور قریب المفہوم الفاظ کی کثرت ہو۔ ہمارے موجودہ ذخیرے میں ایسے مترادفات ہیں اور ان سے خاطر خواہ نفع بھی پہونچتا ہے۔ شجر اور درخت کے ہوتے ہوئے پیڑ کا لفظ بھی ہے۔ بدررو کے ساتھ موری اور نالی کے الفاظ بھی ہیں، جو کبھی ہماری زحمت کا موجب نہیں ہوتے پھر اگر مضمون یا موضوع کے لئے نہیں، وطن کے لئے جنم بھوم، ملک کے لئے راشٹر بھی ہوں تو عقلاً کسی قباحت کا امکان نظر نہیں آتا۔

ضرورت اور غیر ضروری کی دلیل بڑے شد و مد کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ مگر اپنی زبان کے یہ نادان دوست غور سے کام لینا پسند ہی نہیں کرتے۔ انگریزی میں (Wood or Forest) کے لفظ موجود تھے مگر آج نہیں بلکہ اُس وقت جب ہندوستانی کالا آدمی اور اس کی زبان غلاموں کی زبان سمجھی جاتی تھی، انگریزی میں "جنگل" کا لفظ لے لیا گیا اور کسی انگریز نے اعتراض نہیں کیا کہ بلا ضرورت "نیٹو" لفظ کیوں لیا گیا ہے۔ چینی زبان میں ایک لفظ ہے "کاؤ ٹاؤ" اور اُس کا مفہوم وہی ہے جو ہمارے "جی حضوریوں" کا فعل ہوتا ہے۔ انگریزی میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بہت اسلوب ہو سکتے تھے، لیکن یہ لفظ بھی لے لیا گیا اور کوئی معترض نہ ہوا کہ یہ ٹیڑھا بانکا تلفظ ہم سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔

پرانے ادب پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں اور ہر شخص معمولی توجہ سے دیکھ سکتا ہے کہ زبان کے اندر ردو قبول کا فطری عمل ہوتا رہتا ہے اور اسے اپنے اس عمل کے لئے ہمارے کسی اکسانے یا ہماری کوشش کی ضرورت مطلق نہیں ہوتی۔

جہانگیر کو الفاظ میں اصلاح و تصرف کرنے یا نئے لفظ گھڑنے کا شوق تھا۔ اُس نے بہت سے لفظ بنائے۔ چہار شنبہ کو کم شنبہ اور پنجشنبہ کو مبارک شنبہ کہا مگر کسی نے نہ مانا۔ نور جہاں نے ایک خاص قسم کی چوڑیاں وضع کیں، ان کا نام جہانگیری رکھا آج تک جہانگیریاں کہلاتی ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں ہم نے کچھ انگریزی الفاظ کے ترجمے کئے، اکثر نامقبول ہوئے۔ سوسائٹی کے لئے ہم نے ہیئت اجتماعیہ جاری کرنا چاہا، معاشرہ تجویز کیا، مگر مخصوص تحریروں سے باہر کبھی کی زبان پر نہ چڑھے اور ہم نے مطلق کوشش نہیں کی مگر اسی معنے میں سماج کا لفظ چند روز کے اندر عام ہو گیا۔ گارڈن پارٹی کو ہر کہ و مہ سمجھتا ہے مگر عصرہ کا لفظ ان دعوتی کارڈوں ہی پر چھپا ہوا ملیگا۔ پبلک کے مفہوم میں ہم نے جمہور کو رواج دینا چاہا، اخباری صفحوں

سے باہر نہ جا سکا، پبلک نے اسے پبلک ہی کہا اور اب جنتا کو بھی پسند کیا جا رہا ہے۔ ڈیماکریسی کے مفہوم میں جمہوریت ہر وہ آدمی
سمجھتا ہے جو پبلک جلسوں میں شریک ہوتا ہے۔ اب شاید اس کی جگہ جنتا راج کو مل جائے۔ لائحہ عمل پڑھے لکھوں کی زبان سے
بھی بمشکل ادا ہوتا ہے لیکن پروگرام کا لفظ ہر شخص بولتا اور سمجھتا ہے۔ ایسٹ انڈیا ریلوے نے ایک گاڑی چلائی کوئی نہیں
بتا سکتا کہ اس کا نام طوفان میل کس نے رکھا، مگر ہندوستان کے کونے کونے میں یہ نام پھیل گیا۔ اسی نام کا ایک فلم بھی بن گیا
عوام کے اندر، ضرورت ہو نہ ہو، پٹینٹ بمعنے قطعی، فیور بمعنی طرفداری، پینیٹ بمعنی اقط، پارٹ بمعنی جلبہ داری، عام طور سے بولے
اور سمجھے جاتے ہیں اور بھی کچھ الفاظ حال میں داخل ہو گئے اور زبان نے ان کو اپنا لیا ہے۔ مثلاً شدھی، سنگھٹن، نیتا، سامراج۔
وغیرہ۔ غرض زبان مسلمہ طور پر ایک عضو ذیحیات یا جاندار چیز ہے۔ وہ ہر اس غذا کو اُلٹ دیتی ہے جو اسے نامرغوب ہو اور ہر اس
ثقیل اور بادی چیز کو بھی ہضم کر کے خونِ جگر بنا لیتی ہے جسے اُس کی طبیعت قبول کر لے۔ دوسری طرف کچھ پراچینی سجن ہیں جو زبانوں
کے بننے، بدلنے اور بگڑ جانے کے اصول سے بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ عام طور سے چالو اور سمجھے جانے والے سبک اور
ہلکے لفظوں کو چھوڑ کر موٹے موٹے الفاظ ٹھونس رہے اور ایک نئی بھاشا بنا لینے کی دھن میں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں انھوں
نے جو فایدہ سوچا ہے وہ حاصل ہو جائے، لیکن متحدہ قومیت جس کا وہ پرچار کر رہے ہیں ہرگز نہیں بنا سکتے۔ مصنوعی طور پر
کچھ الفاظ لیکھوں اور بھاشنوں میں استعمال کئے تو جا سکتے ہیں جن کا چند روز بعد مر جانا بھی ممکن ہے۔ لیکن چل جانے کی
صورت میں بھی کوئی بڑا کارنامہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لئے کہ اس کی جو قیمت دی جا رہی ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ ایک تو خود
ان بھاشنوں کا مطلب پورا نہیں ہوتا یعنے ان الفاظ کو بہت سے لوگ نہیں سمجھتے۔ دوسرے اس بنا پر باہمی اختلاف بڑھ رہا
ہے جو قومی نقصان ہے۔ کچھ زبان کے اندر مقبول ہو جانے کی صورت میں بھی جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے سو وہ اسی
فیصدی ہندی لفظ بولنے کے بعد بھی جو ہیں سو ہیں۔ جہاں تک یوپی کے ہندوؤں کا تعلق ہے تو یہ متعصبانہ طریق عمل ان کو بزہندو
بنا رہا ہے اور جہاں تک دوسرے صوبوں کے لئے راشٹر بھاشا کو آسان بنانے کا تعلق ہے، سو گجراتی، مرہٹی اور بنگلہ میں پہلے
سے عربی فارسی الفاظ کی کافی آمیزش ہے اور صدیوں سے چلی آ رہی۔ مسلم عنصر زبان میں داخل ہونے سے اگر ہندوؤں کو کوئی
نقصان متصور ہو سکتا ہے تو وہ نقصان تو پہونچ چکا اور سنسکرت یا ہندی بڑھا دینے سے اگر مسلمانوں کا کوئی نقصان متصور
ہو سکتا ہے تو وہ بھی پہونچ چکا۔ تلاش اس کی ہونا چاہئے کہ آخر وہ نقصان تھا کیا؟
ان سجنوں کے سامنے یہ بات بھی ہونا چاہئے کہ فارسی تو سنسکرت کی ماں جائی ہے، فارسی سے تعصب کر کا تو پرائی
چھینک پر اپنی ناک کٹانا ہوگا۔ فارسی اردو تو آریائی نسل کی زبانیں ہیں۔ اب رہ جاتی ہیں ڈراویڈی زبانیں سو انکو سنسکرت
سے قریب لے آنا لغو دلیل ہے۔

"ہماری تمہاری زبان" کے قضئے میں اگر یورپ کی اس مثال کو سامنے رکھا جائے تو شاید ایک مفید بات ثابت
ہو۔ یورپ کے بین الاقوامی معاملات میں، ایک مدت سے اور بالکل فطری طریق پر فرانسیسی زبان استعمال ہوتی چلی آ رہی ہے

جنگِ عظیم کے بعد اس کی جگہ انگریزی لے رہی ہے۔ اس پر نہ تو فرانسیسوں نے واویلا کی اور نہ انگریزوں نے کوشش کی تھی

ہمارے ان پراچینی سجنوں نے اس پر بھی دھیان نہیں دیا کہ سنسکرت صحیح معنی میں کسی وقت بھی عوام کی بول چال نہ بن سکی اور وہ اس تاریخی حقیقت سے بھی آنکھیں چرا رہے ہیں کہ عوام کی ضرورت نے جب پالی کو رائج کر کے سنسکرت کو بارہ پتھر باہر کر دیا تھا، اس زمانے کو بیتے ہوئے ڈھائی ہزار برس ہو چکے ہیں اور مڑ کر دیکھنا سمے کا سبھاؤ نہیں، انسانی ارتقا ایک منزل سے دو دفعہ نہیں گزرتا۔ ہمارے یہ بھائی دنیا کے سامنے اپنے آپ کو سچا بھڑانے میں ممکن ہے کہ کامیاب ہو بھی جائیں کیونکہ یہ زمانہ ہی پروپگنڈے کا ہے، لیکن وہ خود اپنے ساتھ سچے نہیں ہیں۔ آج بھی وہ اپنے بیوی بچوں سے جس زبان میں بات چیت کرتے ہیں وہ، وہ نہیں ہوتی جس میں وہ اپنے لیکھ لکھتے اور ویاکھیان دیتے ہیں۔ انھیں وچار نہیں کہ ان کے لیکھ اور ویاکھیان جنتا کو متاثر نہیں کرتے کیونکہ جنتا ان کو سمجھتی نہیں ہے۔

علم زبان کے ماہروں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ الفاظ توسلی شاعری، توسلی اخلاقیات اور توسلی تاریخ ہیں۔ توسل ایک علمی اصطلاح اور بین الاقوامی لفظ ہے اور اس کا مفہوم ان ابتدائی آثارِ حیات سے ہے، جو زمین کے پیٹ میں سے نکالے جاتے ہیں۔ اب اگر یہ صحیح ہے کہ یہ پراچینی بھائی ہندوستان میں مسلمانوں کی ہر یادگار کو مٹانے پر تل گئے ہیں تو ان بھائیوں کو پھر ایک دفعہ وچار کر لینا چاہئے کہ ان کا یہ خیال کہاں تک مستحسن، کس حد تک ممکن اور کس طرح قابلِ عمل ہو سکتا ہے۔ زبان کے بارے میں تو ان کی یہ کوشش غیر فطری ہے اس لئے ناکام رہنے والی ہے، لیکن اگر بحث کی خاطر مان لیا جائے کہ کامیاب بھی ہو جائے گی تو کیا ان بھائیوں کے سامنے یہ حقیقت نہیں آئی کہ وہ خود اپنی کئی صدیوں کی تاریخ معاشرت کے خزانے اپنے ہاتھوں غارت کر بیٹھیں گے؟ کیا اس طرح وہ مسلمانوں کے ساتھ اپنی رواداری اور بھائی چارے کی زندہ شہادتوں کو فنا نہ کر دیں گے؟ یہ مہاشے اس عظیم حقیقت کو نہیں دیکھ رہے کہ تین ہزار برس پرانا زمانہ زندہ نہیں کیا جا سکتا، اور اگر وہ ایسا اچرج دکھا بھی سکے تو آج کی دنیا کے نقشے میں اسے کیسے بٹھائیں گے؟ یا پنڈت جواہر لال کے لفظوں میں (Fit in) کیسے کریں گے۔ یہ سجن ایک اور سچی بات سے بھی مونھ چھپا رہے ہیں اور وہ یہ ہے کہ زبان اور کلچر کی محافظ اور رکھوالی عورت ہے۔ اور آج ہندوستان کی عورت نئی سڑک پر چل پڑی ہے۔ پچھلے پچاس برس میں یہ بھائی سنسکرت اور پراچینی سبھتا کا پرچار کرنے کے بعد کیا پھل پا سکے؟ ہندو گھروں اور ہندو عورتوں کی بدلتی ہوئی حالت تو نئی روشنی کی طرف لئے جا رہی ہے۔ یہ بھائی اگر آج کی حالت پر سے آئندہ وقت کا اندازہ لگا سکیں تو اپنی عورتوں کو دیکھ کر اُس کا بدلتا ہوا تصور انھیں اپنی کوشش سے ہات اُٹھا لینے پر مجبور کر دے گا، اور اگر گزرے زمانے کے حالات پر آئندہ زمانے کے بارے میں قیاس قایم کر سکتے ہیں تو سوشلزم یا سماج واد تحریک کو نیشنل کانگریس کی پچھلے پچیس برس کی تاریخ کی روشنی میں دیکھنے سے اجاگر ہو جائے گا کہ دیش میں آگے چل کر سماج واد کے وچار پھیلیں گے اور سماج واد "پراچینی پاگل پن" کو ایک منٹ کے لئے نہیں سہار سکتا اور اس کی ایک وجہ ہے۔ وہ وجہ یہ ہے کہ

سماج واد کی تحریک عالمگیر تحریک ہے، غریب مزدور اور کسان کی تحریک ہے۔ اُن بھائیوں نے اس بات کو بھی نہیں دیکھا کہ یہ یوپی میں بیٹھکر جو ملک کو تین ہزار برس پیچھے لیجانا چاہتے ہیں تو ان کے ساتھ پنجاب جائے گا کہ مدراس؟ بمبئی جائے گا کہ بنگال؟ یوپی میں سے آخر یہ سارے ہندؤں کو ساتھ لیجاسکیں گے؟ کشمیریوں اور کایستھوں یا کسانوں اور مزدوروں کو ساتھ لے لیں گے، جبکہ کسان اور مزدور اپنے حق کو سمجھنے اور مانگنے لگ گیا ہے؟ پراچین زمانے میں تو ان غریبوں کی مانگ تو رہی درکنار اپنے جینے کا بھی حق معلوم نہ تھا۔ یہ بھائی خود نہیں سمجھے ہیں کہ ٹیلیفون اور ٹائپ رائٹر، ریل اور موٹر، ریڈیو اور ہوائی جہاز کے لئے پراچین زمانے میں جگہ کیسے نکلے گی؟ تعلیم کا انتظام بدلا جارہا ہے، انڈسٹری پلاننگ ہورہا ہے اور تین ہزار برس پرانا زمانہ زندہ کیا جارہا ہے، اسی کو دنیا طرفہ تماشا کہتی ہے۔

الغرض، اگر ملک کی تاریخ میں ہزار آٹھ سو سال کا زمانہ سادہ اور خالی رکھنے کی ٹھان لی گئی ہے تو دنیا اس کو پاگل پن کے سوا دوسرا نام نہ دے گی۔ میں جتنا غور کرتا ہوں مجھے تو یہ دھن اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی کہ کوئی آدمی سر کو پہاڑ سے ٹکرانے لگے۔ صرف ایک زبان کا مسئلہ اتنا بڑا ہمالیہ ہے جسے اُٹھانا تو بڑی بات ہے چگایا نہیں جاسکتا۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے تک مال کا قانون ایک ہی سا ہے اور مسلم عہد کی یادگار ہے اس کی اصلاحیں مسلم زمانہ ہی سے جاری ہیں اور جس طرح درخت جڑ پکڑ لیتا ہے زراعت پیشہ ہندوستان کے اندر جڑ پکڑ چکی ہیں۔ پھر ضابطہ فوجداری اور عدالت دیوانی کی تمام اصطلاحیں دیہات کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ دکھنی ہندوستان میں نہیں بلکہ مدراس علاقے میں میراث دار وغیرہ قسم کے الفاظ رائج ہیں۔ بنگلہ میں آئین اور آدم شماری قسم کے ہزاروں الفاظ شامل ہیں۔ کہاں تک چھانٹے جائیں گے؟ اور ان کے قایم مقام لفظ آئیں گے کہاں سے؟ گجراتی، مرہٹی اور بنگلہ سے اگر عربی فارسی چھانٹ دی جائے تو بولیاں رہ جائیں گی۔

ان بھائیوں نے خود ہندی کی پوری جانچ نہیں کی ورنہ ان کو دکھائی دیجاتا کہ عربی فارسی کے بہت سے لفظ ہیں جن کے ہم معنی لفظ اگر ہندی میں تھے تو اب ناپید ہیں۔ ان کو نکال کر سنسکرت کے الفاظ رائج کردینا ممکن نہیں ہوسکتا۔ یوپی کے شہروں میں ایسے بہت سے لفظ رائج ہیں۔ برات کی رخصت کو بدا کہا جاتا ہے، زچہ اور بچہ کے لئے ہندی لفظ نہیں ہے۔ جہیز یا دہیز گانوں گانوں میں بولا جاتا ہے۔ کانگریس کی تحریک سے پہلے چرخہ کل ہندی لفظ تھا منگنی کے وقت جہیز ٹھیرانے کو کرارداد کہا جاتا ہے۔ دولھا نوشہ اور اس کے ساتھ شہ والا عام طور سے بولے جاتے ہیں۔ دولھا جامہ ہی پہنتا ہے۔ شربت نوشی کی رسم کثرت سے ادا ہوتی ہے۔ پنجاب کے ہندؤں میں "پلنگ اور چرخہ" جہیز کی خاص چیز ہیں برت کھولنے کے لئے برفی، قلاقند، خرما، بالوشاہی، گلاب جامن، اور حلوا ہی کھایا جاتا ہے

میری سمجھ کام نہیں کرتی کہ مٹھائیوں کے نام بدیسی ہیں مگر انھیں بدلا کیسے جائے گا اور کیا یہ بھائی ان تمام پھلوں کا کھانا چھوڑ دیں گے جو مسلمانوں کے ساتھ آئے؟ سیب، سردہ، خربوزہ، خوبانی، کشمش، بادام وغیرہ اپنے ناموں سے

فارسی ہو نا بار ہے ہیں. کیا وہ گلاب کا سونگھنا چھوڑ دیں گے. لحاف اور رضائی کا دوسرا نام کیا رکھیں گے. یہ لوانی تو یقیناً کریں گے مگر خم ٹھونکنے کے لئے کونسا لفظ ایجاد کریں گے. آج کل کے اصول صحت نے بھی پیتل کے برتنوں میں اندر کی طرف قلعی ضروری قرار دیدی ہے، کیا یہ بھائی اب قلعی نہ کرایا کریں گے؟ ہندوستانی سنگیت کو مسلمانوں نے جس بلندی پر پہونچا دیا کیا یہ بھائی اس پورے حصہ کو سنگیت ودیا سے خارج کر دیں گے، کیا خیال کا گانا چھوڑ دیں گے؟ اچھا مسلمانوں کی تہذیب کے جو افراد صدیوں سے ان کی سرشت بن گئے، خون کے ذرے بن گئے ہیں، ان کو جدا کرنا کیونکر ممکن ہوگا؟

دیہاتیوں اور عوام کو سمجھانے کے لئے سنسکرت الفاظ کا استعمال بھی نامعقول دلیل ہے. گردن اور کمر کے لئے ہندی کا کونسا لفظ استعمال ہوگا. ان لفظوں کو ہر دیہاتی سمجھتا ہے اور کمر کے لفظ ہی سے اس نے ایک کپڑے کا نام کمری رکھ لیا جس کی نیچائی کمر تک ہوتی ہے. حسن اور حسین سندرتا اور سندر کے لئے مغربی یوپی کے دیہاتی ملوک کا لفظ بولتے ہیں جو صورت کے اعتبار سے عربی ہے. اس قسم کی مثالیں گنوانا مقصود نہیں ان سے تو کتابیں بھر جائیں گی. مقصد تو امر واقعہ کی طرف توجہ دلانا ہے.

ان بھائیوں نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے، انھیں نہیں معلوم کہ وہ ان کے بس کا ہے بھی. رامائن اور کبیر و سورداس کے دوہے اور بھجنوں کی کانٹ چھانٹ کر سکیں گے؟ پدماوت کو جلا دینے اور رحیم اور دوسرے مسلمان کویوں کی کتاؤں کو گنگا میں بہا دینے کے بعد ہندی ساہتیہ کی کیا صورت رہ جائے گی اور کیا اس جنون میں دہلی کی مسجد اور آگرے کے تاج کی بنیاد کیا اکھاڑ پھینکیں گے جو مسلمانوں کی نشانیاں ہیں؟

ان مہاشوں نے اگر اپنا طریقہ نہ بدلا اور ٹھونس ٹھانس جاری رکھی تو چند افعال کے سوا باقی زبان دوسری جماعت کی سمجھ سے باہر ہو جائے گی. پھر کیا ایک دوسرے کو سمجھنے سمجھانے کے لئے انگریزی ہی رکھی جائے گی؟ لیکن جب آج بھی مسلم صوبے اور ہندو صوبے ہیں تو کیا پچیس فیصدی براچینی پچیس فیصدی حجازیوں کو سمجھنے سمجھانے پر مجبور نہ ہوں گے اور اس کے برعکس بھی؟

الی سل امیں ذاتی طور پر اسے نہیں مان سکتا کہ ہندو قومی اعتبار سے مسلمانوں کی ہر چیز سے نفرت کرتا ہے. کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندو اسی تعصب کا اظہار انگریز سے نہیں کرتا، حالانکہ قصور مسلمان اور انگریز کا ایک ہی ہے. البتہ مسلمان کی ایک خاص خطا بھی ہے. یعنی اس نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا کر بھارت کو بھرشٹ بھی کر دیا. اس کی سزا بے شک نفرت سے دیجا سکتی ہے اور نفرت ایک فطری جذبہ ہے گو کہ اعلیٰ و پسندیدہ نہیں. لیکن میں بتانا چاہتا ہوں کہ دنیا ایسی نفرت کے متعلق یہی فیصلہ دے گی کہ وہ نفرت بھی گھٹیا قسم کی نفرت ہے.

بایں ہمہ چند سر پھیروں کا خیال یا عمل ساری قوم کے سر نہیں تھوپا جا سکتا اور وہ وقت قریب ہے جب ہندوؤں میں اعلیٰ دماغ اور قوم پرست ہستیاں اس طرف توجہ کریں گی. کیونکہ دلیس میں اگر ایک آدمی بھی ایسے وچار رکھتا ہے تو وہ دیس کے لئے

کلنگ کا ٹیکا ہے۔

زبان کے بارے میں پھر یہی کہنا چاہتا ہوں کہ جو چیز غیر فطری ہے کبھی سرسبز نہ ہوگی اس لئے جتنی وہ کوشش احمقانہ ہے اتنا ہی اس سے ڈرنا بے معنی۔

اب حضراتِ اُردو ہوں یا پراچینی مہاشے، اس سے انکار نہ کر سکیں گے کہ زبان سے ادب اور ساہتیہ وجود میں آتا ہے اور ادب قومی زندگی کا آئینہ اور اُس زندگی کے سنوار سدھار کا ذریعہ ہے۔ دونوں کو اس سے بھی انکار نہ ہوگا کہ ہمارا ادب اور ساہتیہ نہ تو نوے فیصدی ہندوستانیوں کی زندگی کا آئینہ ہے اور نہ اُس نے اس زندگی کے سنوار سدھار میں اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اور اس حقیقت سے بھی انکار نہ کیا جا سکیگا کہ دنیا ایک زبردست ہلچل میں مبتلا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ ایک بہت بھاری انقلاب ہے جو تیزی سے ہمارے قریب ہوتا جا رہا ہے۔

ان واقعات کو دیکھنے کے لئے نہ تو دوربین کی ضرورت ہے اور نہ خوردبین کی۔ جنگِ عظیم کے بعد سے عوام کی تحریکیں زور پکڑتی جا رہی ہیں، طبقاتی تنظیم بہت گرے ہوئے ملکوں میں بھی شروع ہے اور یہ وہ خواب نہیں جس کی مختلف تعبیریں ہو سکتی ہوں۔ ہم اگر اپنے ذہن و خیال کے پٹ بند بھی کر لیں تو آنے والے طوفان کی تیز و تند ہوائیں ان کی چولیں ہلا ڈالیں گی اور ہمیں سمجھنا پڑے گا کہ انسانیت کے مظلوم طبقوں کی بیداری جو دنیا میں نوے پچانوے فیصدی ہے، ایک حقیقت ہے اور دنیا میں جنتا ہی کا راج ہوگا۔ اسوقت عوام کی زبانیں پھیلیں گی، جنتا اپنی تہذیب اور سبھتا خود بنائے گی۔ اس لئے چاہے وہ اُردو کا ادب ہو یا ہندی کا ساہتیہ اپنی بقا کے لئے ان کو چولا بدلنا ہی پڑے گا۔ اُردو میں ایسے بے شمار اسلوب در آئیں گے جن کو عوام سمجھتے ہونگے ہندی سے وہ شبد نکال پھینکے جائیں گے جن کو جنتا سمجھتی نہ ہوگی۔

زبان کی موجودہ چپقلش اصل میں زبان اور کلچر کی نزاع نہیں بلکہ مفاد اور اغراض کی چالاکیاں ہیں۔ مخصوص اور قابو یافتہ طبقے، ہندو اور مسلمان دونوں، اپنی اغراض اور اپنے تفوق کو برقرار رکھنے کے لئے چالیں چل رہے ہیں۔ لیکن زبان اور کلچر کے بارے میں صرف فطری قانون کام کریں گے اور اُس فطری قوت کے سامنے نہ شیخ صاحب کی ضد قائم رہ سکے گی نہ مہاشے جی کی نفرت۔

فلسفۂ زبان کے ماہر یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہم جو کچھ بولتے ہیں وہ ہمارا باطن یعنی ہماری وچار آتما ہوتی ہے اور ہم الفاظ کے ذریعے سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ ہمارے خیال، ہمارے عندئے، ہمارے احساس، ہمارے ارادے، اور ہماری خواہشیں الفاظ ہی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں اور الفاظ ہی کے اندر چھپی رہتی ہیں۔ الفاظ اور ان کی ترتیب پر قادر ہو کر ہم اپنی دلی باتوں کو موثر طریقے سے ظاہر کر سکتے ہیں اور دوسروں کے الفاظ میں چھپے ہوئے معنی کو سمجھ لیتے ہیں اور یہ قدرت ہمارے اندر ہی ہے۔ الفاظ کے ذریعے سے ہم ہر چیز اور ہر بات کی جانچ کرنے کے قابل ہوتے ہیں اور اُس جانچ کا نتیجہ ہوتا ہے اس کے اسباب و علل کا طویل سلسلہ ایک پل بھر کے اندر ہمارے خیال میں طے ہو جاتا ہے اور ہم نہیں سمجھتے

کہ یہ کس طرح ہوگیا۔

اس حقیقت کے ہوتے ہوئے اس چیز سے کام لینا انسانیت کا تقاضا ہے، پاسکل کے بقول، جس نے ہمیں اشرف بنادیا ہو اور وہ چیز ہمارا تفکر اور وچار ہے۔ انسانوں کی وہ دو جماعتیں جو ایک ہی خاک پاک سے بنی ہوں، ایک ہی زبان صدیوں سے بولتی آرہی ہوں، جن کے سوچنے کا طریقہ ایک ہو، وہ ادنےٰ و حقیر باتوں کے فرق کو قومیت اور کلچر کا اختلاف قرار دیں اور اسی پر باہم دست وگریباں ہو جائیں، ہوش وخرد کی بات تو نہ کہی جائے گی، دونوں جماعتوں کو عقل و خرد سے کام لینا ہی پڑیگا کوئی جماعت عقل کو طلاق دیکر زیادہ مدت نہیں جی سکتی

ہندوستان کے اندر مسلمانوں کا وجود ہے اور صدیوں سے ہے اور مسلمان ہندوستان کا قومی سرمایہ ہیں نیز آٹھ نو کروڑ کی تعداد اتنی چھوٹی تعداد نہیں جس کا مٹانا آسان ہو یا جس کو کہیں منتقل کر دینا ممکن، اور یہ بھی محال ہے کہ ملک کی ایک چوتھائی آبادی نظر انداز کی جاسکے۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت کہ نام کے ساتھ یائے نسبتی کا دم چھلا آجکل فیشن ہے، لیکن واقعاً دیکھئے تو اصلی یائے نسبتی ایک ہی ہے اور وہ ہندی کی یائے نسبتی ہے۔ عرب سے آنے والے بہت قلیل تھے۔ وہ عورتیں ساتھ نہیں لائے تھے۔ لہذا اُس محدود یائے نسبتی میں کھوٹ تو یہیں سے ثابت ہوگیا۔ اب وہ مسلمان جو ہندوستان ہی کے رہنے والے ہیں اُنھیں کی یائے نسبتی یعنے "ہندی" کھری قرار پاتی ہے اور اُسی کی اکثریت بھی ہے یعنے مسلمانوں کا سواد اعظم ہندی ہے۔

چنانچہ محض عقیدے کی بنا پر اپنی قومیت جدا بنانا اور جدا کلچر کا دعوے کرنا لاطائل بحث ہے اور محض عقیدے کی بنا پر اپنے ہی گوشت و خون کو غیر سمجھنا اپنے اعضاء کو کاٹ پھینکنے کی حماقت کے سوا دوسرا نام نہیں پاسکتا۔ جن انسانوں کا ملک و وطن ایک ہو، عادت و خصلت ایک ہوں، خیال و احساس کا طریقہ ایک ہو، خون و گوشت ایک مٹی سے بنے ہوں، غرض ہر لحاظ سے وہ معمولی و سطحی جماعتی فرق و اختلاف کے علاوہ ایک ہیں اور ایک قوم ہیں۔ جتنی کچھ غیریت تھی وہ خون کی آمیزش اور ہندوستان کی طویل وطنیت سے صدیاں ہوئیں کہ غائب ہو چکی ہے اور جن باتوں کا فرق گنوایا جاتا ہے وہ فرق تو ایک صوبہ کے ہندو اور دوسرے صوبہ کے ہندو میں، ایک صوبہ کے مسلمان اور دوسرے صوبہ کے مسلمان میں ہی نہیں بلکہ ایک شہر کے اور ایک گھر کے دو ہندوؤں یا دو مسلمانوں میں ملے گا۔ اس فرق و امتیاز کو جدا کلچر اور جدا قومیت کی وجہ قرار دینا عقل کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتی۔ اور یہ حقیقت جس قدر جلد محسوس کرلی جائے قوم و وطن کے لئے اتنا ہی زیادہ بہتر ہوگا۔

علمائے زبان کا ایک اور فتوے بھی ہے۔ جس کو سمجھ لینے کے بعد الفاظ کی درآمد سے ڈرنا بے معنی معلوم ہوگا۔ الفاظ کے طبقے اور گروہ ہوتے ہیں، اُن کے خاندان اور شجرے ہیں، ان میں ائتلاف اور ہم جنسی ہوتی ہے، ان میں شریف اور رذیل ہوتے ہیں اور ان میں صحبت کے اثر سے اچھے بُرے ہو جاتے ہیں اور بُرے اچھے۔ چنانچہ جو لوگ زبان کے فلسفے سے واقف نہیں لیکن الفاظ کا استعمال کرنا جانتے ہیں وہ بھی بتا سکیں گے کہ ایک ہی مفہوم کے متعدد لفظ سامنے ہونے پر بھی ایک

مناسب لفظ کی تلاش کا کانٹا کھٹکتا رہتا ہے اور کسی وقت ایک مفہوم کے لئے مناسب اور صحیح لفظ ذہن میں بجلی کی طرح آجاتا ہے تو ایک نیا تصور، نیا خیال، عبارت میں نیا زور پیدا کر دیتا ہے اور ایسا لفظ سوجھ جانا وہ الہام ہے جو سننے یا پڑھنے والے کے ذہن و فہم میں ایک ایسے تار کو چھیڑ دیتا ہے کہ وہ بھی مصنف کے ساتھ ہم صفیر ہو جاتا ہے۔

آج تک کوئی مصنف اپنی زبان کے تمام الفاظ استعمال نہیں کر سکا۔ ایک مصنف انھیں الفاظ کو استعمال کرتا ہے جسکی روح معانی سے وہ آشنا ہو چکا ہے اور جن الفاظ کو ایک مصنف استعمال نہیں کرتا ان کو دوسرا کمال خوبی اور زور بیان کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ پھر ایک ہی مصنف مختلف موضوعات پر قلم اُٹھاتا ہے اور ارسطو کے قول کے مطابق زبان کا رتبہ موضوع کے رتبے کے مطابق ہونا چاہئے، یعنی ایک ہی مصنف ایک جگہ الفاظ کا ایک سیٹ استعمال کرتا ہے اور موضوع کی مناسبت سے دوسرے مضمون میں دوسرا سیٹ۔ پھر ایک ہی سیاق و عبارت میں ایک لفظ مختلف لوگوں کے سامنے مختلف تصورات پیش کر سکتا ہے اور لغت کے اندر لفظ کی جو حیثیت ہوتی ہے عبارت میں آکر بدل جاتی ہے۔ الفاظ نرم و نازک بھی ہوتے ہیں اور سخت و کرخت بھی، مکدر و تلخ بھی ہوتے ہیں اور تکلیف دہ و خوش کن بھی، اور ان کی یہ مختلف حیثیتیں ان الفاظ (اسماء) کے ان تصورات کے مطابق ہوتی ہیں جو وہ ہمارے اندر پیدا کر دیتے ہیں۔

ان حقایق کو سمجھ لینے کے بعد مروجہ عربی فارسی الفاظ سے چڑھنا یا بعض نئے سنسکرت الفاظ کے داخلے پر برافروختہ ہونا ناممکن ہو جاتا ہے اور زبان کے مذہب میں تو یکسر نارو ا ہے۔ الفاظ لغت کے اندر زیادہ سے زیادہ ہوں لیکن ان کا استعمال تو میرے آپ کے ذوق و انتخاب پر ہے اور وہ ایک فطری طریقہ ہے۔ بولتے وقت میں آپ کو سمجھاتا ہوں، اور سنتے وقت آپ مجھے یعنی میرے معبود ذہنی کو سمجھنے کی کوشش پر مجبور ہیں۔ آپ اگر نہیں سمجھ سکے تو میرا کہنا بیکار گیا۔

ہماری زبان جسے خواہ اُردو کہئے یا ہندی، لیکن آیندہ وہ ہندوستانی کے نام سے جانی جائے گی اپنی ساخت اور بناوٹ کے اعتبار سے آریائی زبان ہے۔ تصریحات میں جائے بغیر میں اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ہماری زبان ضرورت انسانی کے تحت وجود میں آئی، فطری قاعدوں کے تحت پروان چڑھی۔ باہر سے آنے والی قوم کی ضرورت قوی تر تھی اس لئے ملک میں بسنے والی قوم کی زبان کے الفاظ زیادہ سیکھنا پڑے۔ مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئے تو عربی، ترکی، فارسی بولتے ہوئے آئے ہوں گے، اور اپنے بدن کے اعضا اور رشتہ داروں کے نام ساتھ لائے ہونگے لیکن یہاں پہونچ کر انھوں نے خالص ہندی چیزوں ہی کے نام نہیں سیکھے بلکہ اپنے اعضاء کے ناموں کے بدلے بھی ہندی اسماء اختیار کر لئے۔ اعضائے جسمانی اور رشتوں کے نام دو چار کے سوا تمام ہندی ہیں۔

جہالت کے نتیجے میں، ضد کر کے اگر کوئی قوم اپنی زبان کو محدود رکھنے میں بامراد ہو جائے تو اس کے لئے تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ کسی انسانی گروہ کے وحشی و نامہذب ہونے کا اٹل ثبوت اس قوم کی زبان کا افلاس ہے اور اُسے پستی میں ڈالے رکھنے والی چیز بھی اس کی زبان کی بے مائگی ہی ہے کیونکہ کسی انسان کو اتنا ہی علم کرایا جا سکتا ہے جتنا ان لفظوں کے

اندر ہے جنھیں وہ سمجھتا ہے۔ یعنی زبان کا سرمایہ الفاظ بڑھے بغیر کوئی قوم ادبار کے گڑھے سے اُبھر نہیں سکتی۔ یہی بات اس نظریے کی بنیاد بن گئی کہ جس طرح زبان خیال کے لئے غذا بہم پہونچاتی ہے اُسی طرح اس کو محدود بھی رکھتی ہے۔

مسئلے کی علمی و منطقی صورت اگر یہ ہے جو آپ نے دیکھی تو بہ ضرورت و غیر ضرورت کی غیر منطقی دلیل لاکر زبان میں الفاظ کے داخلے پر سنسر بٹھانا صرف زبان کے ساتھ دشمنی نہیں بلکہ اخلاقی خودکشی بھی ہے۔

جو لوگ منطقی طور پر سوچنے کے عادی ہیں وہ سبب و علت پر غور کر کے کسی نتیجے پر پہونچنا چاہتے ہیں۔ زبان کی موجودہ حجت و بحث میں، یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ آخر کیا اسباب ہو سکتے ہیں جو صدیوں سے ایک زبان بولتے بولتے ایک جماعت اس زبان سے بیزار ہو جائے جو باہمی رواداری، اور قومی ہمرنگی کی ایک جیتی جاگتی مثال ہو، جسے دو بڑی جماعتوں کی متحدہ اور متفقہ کوششوں نے پروان چڑھایا ہو۔

اس طرح پر غور کرنے سے سیاسی اسباب سب سے پہلے سامنے آتے ہیں اور غیر ملکی حکومت کے لئے ۱۸۵۷ء کے واقعہ کی تکرار کو روکنے اور اپنا استحصال برقرار اور جاری رکھنے کا آسان اور یقینی نسخہ یہی تھا کہ باہم پھوٹ ڈالدی جائے۔ یہ پالیسی کسقدر کامیاب ہوئی اس پر روشنی ڈالنا تحصیل حاصل ہے۔ سرکاری نوکری کی آپا دھاپی سے صدیوں کے جڑے دل پھٹتے گئے اور الیکشن کے ساتھ جداگانہ انتخاب نے اس پھوٹ کو پکا کر دیا۔ زبان کا شاخسانہ بھی حکومت کا کھڑا کیا ہوا ہے، جس کی بنیاد ڈالنے کا کام سر انٹونی میکڈانل نے انجام دیا تھا۔ اختلاف کی اصل جڑ تو یہ تھی۔ لیکن قریبی اسباب میری ناچیز عقل کے مطابق یہ ہے کہ مسلمان اپنی حکومت کے زمانے میں احساس برتری بنکر رہ گیا تھا اور چونکہ اُردو کی ابتداء عوام کے میل جول کا نتیجہ تھی جو اس کے نام سے ظاہر ہے اور اسی وقت کی اعلےٰ سماج کا معیار شرافت مرتبہ اور دولت تھی، اس لئے جاگیرداری سماج عوام کو اجلاف یعنے رذیل کے نام سے پکارتی تھی۔ لہذا وہ زبان بھی شرفاء یعنے امراء کے نزدیک تحقیر کی نظر سے دیکھی گئی۔ اشراف جس میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے اُردو لکھنا بولنا اپنی ذلت سمجھتے تھے۔ اس عندئے کا وجود غالب کے وقت تک تھا لیکن زبان انسان کے اختیار میں نہیں بلکہ انسان زبان کے بس میں ہوتا ہے، اس لئے اس زمانہ کے شرفاء و امراء اسی اجلاف کی زبان کو اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے اور اُردو جس کا مفہوم ہی "سوقیت" تھا اب "اُردوے معلےٰ" قرار پائی یہانتک کہ وہ غالب جن کے لئے اردو تنگ تھی اُردو ہی میں ایک نشان راہ چھوڑ گئے۔

مسلمانوں کے اس احساس برتری میں بابر کا خیال کار فرما تھا جسے ہندو معاشرت میں ہر چیز قابل مضحکہ نظر آتی تھی اور اس لئے مسلمانوں سے یہ خیال کبھی ترک نہیں ہوا کہ وہ ہندوؤں سے برتر ہیں۔ چنانچہ ہندو ادبار و شعراء کے بہتر سے بہتر کلام میں بھی انھیں ہمیشہ "بوئے کچوری" آیا کی۔ اس خیال کا وجود شہر کی زندگی میں بھی ملتا ہے۔

بظاہر یہ خاص وجوہ ہو سکتے ہیں جن کی بنا پر ہندو تعلیم یافتہ جماعت کو اُردو سے محبت کم ہوتی گئی اور دماغوں میں یہ بات جگہ بناتی رہی کہ اُردو ہی مسلمانوں کی زبان۔

اس چیز کو ہماری ایک دوسری زبردست غلطی نے مدد پہونچائی اور وہ غلطی یہ تھی کہ برطانوی حکومت کی عیاری کو نہ سمجھ کر ہم ہندی کی تحریک کے مدمقابل بن بیٹھے، اور زبان کے مشترک ورثے پر اپنے واحد حقدار ہونے کا اعلان کر دیا۔ نواب محسن الملک کی لکھنؤ کی تقریر کے بعد ہندو ہندی کی تحریک پر اٹل ہو گئے، نواب محسن الملک گوشہ نشین کر دئے گئے اور ہندی کی سرپرستی کی جانے لگی۔

اُسوقت اگر مسئلے کو فریقانہ نظر سے نہ دیکھا جاتا تو اس سے زیادہ نہ ہوتا کہ عدالتی سمنوں پر ایک طرف ناگری حروف میں وہی زبان چھپ جایا کرتی۔ بالکل اُسی طرح جیسے تبلیغ و تنظیم کے بعد تک شدھی سنگھٹن کی تحریکیں شدومد سے چلیں، مگر جب ہم تھک کر بیٹھ گئے وہ بھی ٹھپ ہو گئیں۔

ان بنیادی غلطیوں کے ساتھ ہم نے ایک اور غلطی بھی کی، یعنے بیسویں صدی کے شروع میں ہم نے زبان کو مشکل اور کٹھن بنانا شروع کر دیا اور اس بات کو بھول گئے کہ اسے ہندو بھی بولتے پڑھتے ہیں۔ اب چونکہ اُردو کی تعلیم حصول معاش کے لئے ضروری نہ تھی اور امتحان ہندی میں بہت آسانی سے پاس کئے جاسکتے تھے، ہندوؤں نے اپنے بچوں کے لئے اُردو کی تعلیم کو بالکل غیر ضروری اور نقصان کا باعث سمجھ کر اس کا پڑھانا بند کر دیا۔

اسوقت بھی ہم ایک بڑی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اسوقت ہماری ساری توجہ زبان کو آسان بنانے، کم سے کم قیمت پر کتابیں، اخبار اور رسالے چھاپنے اور اسکی تعلیم کو سہل بنانے میں صرف کرنا چاہئے، تعلیم بالغان پر انتہائی زور دینا چاہئے، مگر اس کے بدلے ہم بین و بکا اور شور و غوغا پر اُتر آئے ہیں اور اس طرح ضد اور عناد کی آگ بھڑکا رہے ہیں۔ یہ صورت اُردو کے حق میں خودکشی کے مترادف ہے۔

ہم شاید بھول گئے ہیں کہ دنیا دار مکافات ہے اور کوئی عمل ضایع نہیں ہوتا، ردعمل ضرور ہوتا ہے، یہ ایک فطری قانون ہے۔ زبان کی خودسرانہ فطرت ہماری متعصبانہ کارروائیوں کو تو نہ چلنے دیگی لیکن جو ہندو آج اُردو لکھ پڑھ لیتے ہیں کل وہ بھی اُسے ترک کر دیں گے اور اُردو کا حلقۂ اثر و عمل زیادہ محدود ہو جائے گا جو بالآخر نشر و اشاعت کی کمی کا باعث ہو گا۔ یہ حقیقت آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

آخر کلام پر ایک نظر اس پر بھی ڈال لینا چاہئے اور ممکن ہے کہ یہی توجہ ہماری کوششوں کے دھارے کا رخ بھی بدل دے، کہ اس زبانی جھگڑے میں کس طبقے کے لوگ مبتلا ہیں؟ اس کا پتا چلانے کے لئے کسی گہرے سوچ اور غائر مطالعے کی ضرورت نہ ہوگی۔ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ دو مزدور یا دو دیہاتی زبان اور کلچر کی بحث پر آپس میں لڑے ہوں یا انھوں نے کبھی ان چیزوں پر دھیان بھی دیا ہو۔ حقیقت میں ہندوستان کی پچانوے فیصدی آبادی ان چیزوں کے وجود سے بھی باخبر نہیں۔ ان کی سمجھ میں کبھی نہ آسکے گا کہ یہ بھی کوئی لڑائی جھگڑے کی بات ہوسکتی ہے اور جسے قوم یا جنتا کہا جاتا ہے وہ انھیں پچانوے فیصدی مزدور کسانوں سے عبارت ہے۔ چنانچہ ایک حقیقت کا تلاشی

ایک بے لوث سوچنے والا یہی نتیجہ نکال سکتا ہے کہ معناً یہ زرگری جنگ ہے۔

اس کے سامنے یہ تاریخی حقیقت آئے گی کہ جاگیرداری حکومت نے مسلمانوں سے پہلے اور مسلمانوں کے عہد میں بھی عوام کو یہ موقعہ ہی نہ ملنے دیا کہ وہ اپنی حالت پر سوچ سکیں اور بادشاہت کی اس اسکیم میں مولوی برہمنوں سے مدد لیگئی۔ چنانچہ ایک راجہ برہمن مشیر تو رکھتا تھا لیکن جوابدہ وہ کسی کے سامنے نہ تھا۔ ایک بادشاہ جب ظل اللہ ٹھیرا تو اسکی شکایت کیسی اور کی کس سے جائے؟ انتہا یہ ہے کہ خدا کے مہربان ہونے کی علامت شاہی عنایت و اکرام سمجھے گئے۔ حکومت کے اس ڈھنگ کو مضبوط بنانے میں ذاتوں کی تقسیم بہت کارآمد ثابت ہوئی اور اس سے مسلمان بھی اسی طرح متاثر ہوئے جتنے ہندو ہو چکے تھے۔ دھرم کرم اور تقدیر کا سبق سنا سنا کر غریب عوام کو سنجیدگی سے محسوس کر لینے کے ساتھ گہری قناعت سکھا دی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ راج اور بادشاہی کی جڑیں مضبوط بنتی رہتی تھیں انسانی مساوات اور اسلامی اخوۃ کے عندئے دفن کئے جا چکے تھے۔

سلطنت کے ساتھ خدا کے سائے کا خیال بہت گہرا قایم ہو گیا تھا اور اس خیال کے مستحکم ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ اتم کا نیچ پر اشراف کا اجلاف پر سیاسی و اقتصادی غلبہ استمراری ہو جائے اور چونکہ اس سماجی و سیاسی اسکیم میں حدبندیاں سخت تھیں، اس لئے اتم اور نیچ دونوں سماجوں میں تنزل آنا لازمی چیز تھی اور اعلےٰ کو ادنےٰ پر جو برائی مل چکی تھی اس کی وجہ سے اقتدار یافتہ سماج میں بیکار اور نٹھلوے آدمیوں کی تعداد ملک میں بڑھتی رہی۔ مذہبی رہنما خیرات پر بسر کرنے لگا اور زمیندار معافی دار غریبوں کی محنت کا نتیجہ چھین کر کھانے لگا اور اس طرح بے شمار نٹھلوے موٹے اور دبیز ہوتے رہے۔ سماج کی یہ صورت مغلوں کے عہد میں نیم مذہبی بلکہ مذہبی عقیدے کی صورت میں ملک کے طول و عرض پر چھا گئی تھی۔

مغل حکومت کے زوال، اور ہندو ریاستوں کی باہمی رقابتوں نے انگریزوں کو تداخل کی دعوت دی، اور ہندو مسلمانوں کے یہی نٹھلوے اور مراعات و حقوق یافتہ طبقے انگریز کے ساتھ ہو گئے۔ انگریزی حکومت نے ان کی پوری پوری سرپرستی کی۔ انگریزی عہد نے ان رعایتوں کی حقدار جماعتوں میں کچھ اضافہ ہی کیا۔ یعنی وکیلوں اور پنشن خواروں کی نئی جماعتیں بھی پیدا کر دیں اور یہ وہی پرانی جاگیرداری حکومت کے پس ماندہ اور سامراجی ذریات ہیں جو اپنی رعایتوں اور اقتدار کی خاطر پاؤں پیٹ رہے اور عوام کو ایسے بے بنیاد مسئلوں اور جھگڑوں میں پھنسائے رکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے مقصد اور برتری کی طرف سے ہمیشہ کی طرح غافل رہیں اور ان کے تفوق اور فربہ ہونے کے ذرایع یعنی کونسلوں کی کرسیاں اور وزارتیں محفوظ رہیں، قانون سازی کی مشین پر ان کا قبضہ ہو تاکہ ان کے ہاتھ سے وہ نہ نکل سکے جسے یہ صدیوں سے غصب کئے چلے آرہے ہیں۔ برہمنی ذہنیت کا وہی پرانا سین پھر دیکھنے میں آرہا ہے کہ زبان مخصوص طبقے کی چیز بنی رہے علم و فن کی ٹھیکہ داری ان کے ہاتھ سے نہ نکلنے پائے۔

مگر چونکہ غریب کی اس مانگ کے سامنے کہ وہ بھوکا ہے، محنت کرکے بھی بھوکا رہتا ہے، کوئی طاقت ٹھہرنے والی نہیں، اس لئے ان بحثوں اور قضیوں کی بنیادیں کمزور ہیں اور بالآخر ختم ہو جانے والی ہیں، یہ جھگڑے بغیر چکائے چک جانے والے ہیں، لیکن یہ اسی وقت ہوگا جب ملک کی سیاسی اُلجھنیں صاف ہوں گی اور صحیح و واضح سیاسی تصورات قومی لیڈروں اور مختلف جماعتوں کے سامنے آجائیں گے۔ مگر جماعتوں کے سیاسی تصورات اسی وقت صاف و واضح ہو سکیں گے جب عوام کی تحریکیں زور پکڑ کر درمیانی طبقے کی لیڈری کو ختم کریں گی اور عوام کے لیڈر، عوام میں سے پیدا ہونے لگیں گے اسلئے کہ خاص طبقوں کی خاص رعایتیں ختم کرنے کا قانون درمیانی طبقوں کے نمائندے کبھی نہیں بنائیں گے۔ وہ تو مزدور نمائندے ہی بنا سکتے ہیں۔ بہرحال یہ وقت زیادہ دور نہیں۔ اس زمانے میں وقت کی رفتار کی تیزی ہمارے خیال میں نہیں آسکتی۔ وہ بہت تیز ہو گئی ہے۔ آنے والے انقلاب کی جھلک اُس ادب میں دیکھی جا سکتی ہے جو آجکل پیدا ہو رہا ہے لیکن اس کے باوجود وہ وقت اپنے وقت پر آئے گا۔

لیکن اگر "مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست"، کی تعلیم سچی ہے، اگر زمانے سے ساز کر لینے کے اُصول غلط نہیں، اگر انسانی مساوات فطرت کا منشاء ہے، اگر مسکین اور اُفتادہ کی مدد مذہبی فریضہ ہے، تو ہندوستان کے ان "رعایت خور" طبقوں کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو عوامی تحریکوں سے وابستہ کر دیں، اقتدار اور استحصال سے ہاتھ اُٹھا لیں، اور انسانیت اور اپنے ملک کے لئے ایک معزز مقام حاصل کرنے میں لگ جائیں، یعنی غلامی کی لعنت کو اپنی اور اپنے ملک کی پیشانی سے دھو ڈالیں۔ دوسرے ملکوں میں "رعایت خور طبقوں" کے اکثر افراد نے اس کو سمجھا اور اس پر عمل کیا ہے۔

ل۔ احمد

نگار کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کرلیں قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:- (سنہ ۲۶ء) جنوری ۵ر- (سنہ ۳۰ء) مئی ۴؍ر- (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴؍ر فی پرچہ- (سنہ ۳۲ء) جنوری ۱۲ار- فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴؍ر فی پرچہ (سنہ ۳۳ء) فروری و جولائی ۴؍ر- (سنہ ۳۴ء) فروری ۵ر- (سنہ ۳۵ء) فروری، مئی، جولائی، اگست، اکتوبر، نومبر دسمبر ۵ر فی پرچہ- (سنہ ۳۶ء) جنوری ۸ر- فروری تا دسمبر (علاوہ مئی، جون و ستمبر) ۶ر فی پرچہ- (سنہ ۳۷ء) جنوری ۸ر مارچ تا اگست ۶ر فی پرچہ-

منیجر نگار- لکھنؤ

اشتراکیت اور اس کا مستقبل

غلامی کی سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد افراد قوم کی قوت فکریہ بھی غلامانہ ذہنیت کی شکار ہو جاتی ہے۔ اجتہاد اور غور و فکر کا مادہ رخصت ہو جاتا ہے اور قوم کی قوم اندھی تقلید میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جس کا آج سے نہیں تقریباً نصف صدی سے رونا رویا جا رہا ہے۔ لیکن غضب تو یہ ہے کہ وہی حضرات جو ہمیں پکار پکار کر اس دماغی غلامی سے باخبر کر رہے ہیں۔ اب تک اِس لعنت سے اپنی گلو خلاصی نہیں کر پائے ہیں۔

ان ہادیانِ قوم کے لئے کسی مسئلہ پر عقل و درایت سے غور کرنا قطعی نا ممکن ہے۔ کسی مسئلہ کی خوبیوں کی دلیل ان کے پاس عموماً یہی ہوا کرتی ہے کہ "چونکہ یہی اقدام دوسرے ممالک میں کامیاب ثابت ہو چکے ہیں ہمارے یہاں بھی بامراد ہوں گے انقلاب فرانس نے فرانس کو حیات نو بخشی۔ روس میں اشتراکیت ایک حد تک کامیاب ثابت ہوئی۔ جرمنی اور اٹلی میں ہٹلر اور مسولینی کی مطلق العنانی نے سحر سامری کا کام کیا۔ ہندوستان میں بھی اگر وہی ماحول پیدا کر دئے جائیں تو یہاں بھی وہی نتیجے نکلیں گے جو دوسری جگہ ظاہر ہوئے"۔ لیکن ایسے حضرات اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ واقعاتِ عالم تکرار سے یکسر معرّا اور مبرّا ہیں اس رواں دواں دنیا میں ایک ہی چیز دو دفع نہیں ہوتی آواگون کا مسئلہ اب بہت فرسودہ ہو گیا۔ احباب کی صحبتوں میں ان پر خوش گپیاں تو بیشک ہو سکتی ہیں۔ لیکن قوم و ملک پر اس کا تجربہ ایک مہلک مشغلہ ہے۔

اس قسم کی کورانہ تقلید کی بین مثال موجودہ دور میں سوشلزم یا اشتراکیت کا تصور ہے۔ عوام کے لئے تقلید تو خیر ناگزیر ہے۔ لیکن حیرت تو یہ ہے کہ ہمارے خواص بھی جب سوشلزم کا ذکر آتا ہے تو غیر تقلیدی انداز اختیار کئے بغیر نفس مسئلہ پر غور کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ ان کے پاس سوشلزم بلکہ کمیونزم کی خوبیوں کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ روس ایسا تباہ حال ملک بھی اسی کے بدولت آج دنیا کے متمدن ممالک سے ہم سری کا دعویٰ کر رہا ہے اور یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ خود روس کے ارباب حل و عقد اپنی کامیابیوں پر حیرت زدہ ہو رہے ہیں یہی تقلیدی انداز گفتگو ہم جو حامیانِ اشتراکیت کی سب سے بڑی دلیل سمجھی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج انقلاب روس کے قصیدوں کی صدا گوشے گوشے سے بلند ہو رہی ہے۔

بیجا نہ ہوگا اگر پہلے اسی خواب خوش آیند کی تعبیر بیان کر دی جائے بعدہٗ نفس مسئلہ یعنی سوشلزم کی طرف

رجوع کیا جائے یہ دعوےٰ ایک حد تک صحیح ہے کہ روس میں جو کچھ ہوا وہاں کے لئے وہی مناسب تھا۔ بولشوزم نے ۲۰ - ۲۲ سال میں روس کے لئے وہ سب کچھ کر دیا جو صدیوں کی آمریت نہ کر سکی تھی۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ جو کچھ وہاں ہوا کیا اس کا امکان یہاں بھی ہے۔ کیا روس کی تقلید یہاں بھی کارگر ہو سکتی ہے؟

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ "روس اور ہندوستان کے ماحول میں بہت زیادہ مشارکت ہے۔ روس بھی ہندوستان ہی کی طرح ایک پست۔ فلاکت زدہ۔ جاہل۔ زراعتی ملک تھا ہندوستان کی طرح وہاں بھی ساہوکار اور زمیندار جونک کی طرح کاشتکاروں اور مزدوروں کا خون چوس رہے تھے۔ وہاں کی حکومت بھی ہندوستان ہی جیسی ایک غیر ذمہ دار بیوروکریسی تھی وہاں بھی حکام وقت زار سے لیکر ادنیٰ چوکیدار تک اتنے ہی ظالم و جابر تھے اس لئے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ کمیونزم وہاں تو رحمت ثابت ہو اور یہاں کے لئے قہر ہو جائے؟" لیکن اہل نظر ان سطحی مشارکتوں کے فریب میں نہیں آسکتے ہیں۔ روس اور ہندوستان میں سب سے بڑا فرق تو یہ ہے کہ ہندوستان ایک غلام ملک ہے اور روس ایک آزاد ملک تھا۔ روس میں غیر ملکی سنگینوں کے بل پر زار کی حکومت نہیں قایم تھی بلکہ وہ روسیوں ہی کی تلواریں تھیں جو ابنائے وطن کو ذبح کر رہی تھیں۔

دوسری بات یہ کہ روس میں بولشوزم کی کامیابی محض لیڈروں کی اسپیچوں اور اخبارات کے جوشیلے مضامین کی رہین منت نہیں ہے۔ وہاں جو کچھ ہوا ایک حد تک بزور شمشیر یعنی جبریہ ہوا۔ جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے پورا ملک مضطرب تھا۔ حکومت کی سختی نیز اشیائے خورد و نوش کی کمی سارے ملک کو مع افواج کے بغاوت پر آمادہ کئے ہوئے تھی۔ بدقت پاکر ایک منظم جماعت اٹھی۔ فوج نے اس کا ساتھ دیا اور اس نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ خوب خانہ جنگیاں ہوئیں اور آخر کار خون کی ندیاں بہاکر بولشوک جماعت برسر اقتدار ہو گئی اور پھر ہر ممکن جبر ظلم و تعدی کو بروئے کار لاکر پورے ملک میں اشتراکیت کا بول بالا ہو گیا۔

روس میں بولشوک جماعت کی کامیابی کا تیسرا سبب یہ ہوا کہ وہاں اشتراکیت کا اجرا اور اس کے لئے خانہ جنگی اسوقت شروع ہوئی جب جنگ عظیم نے دنیا کی تمام حکومتوں کو جنگ کے تکان نیز اس کی تباہ کاریوں کے ہجوم سے پریشان کر رکھا تھا اور خانہ جنگی کے زمانہ میں کسی کو دخل دینے کی ہمت نہ تھی۔

جب واقعات کا یہ عالم ہو تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ دونوں جگہ حالات تقریباً یکساں ہیں۔ اور جو طریقہ وہاں اختیار کیا گیا وہی یہاں کرنے بھی مناسب ہوگا۔ ہندوستان کے لئے پہلا سوال حصول آزادی کا ہے اور تا وقتیکہ ہم خود مختار نہیں ہو جاتے ہیں، سوشلزم، کمیونزم یا بولشوزم کی باتیں محض شاعری ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ سوشلزم اگر ہمارا منزل مقصود ہو تو ہوا کرے لیکن مقصد اور ذریعہ میں تمیز نہ کرنا حد درجہ کی بدتمیزی ہے۔ یہ تو محض زبانی باتیں ہیں کہ سارے کا سارا ہندوستان صرف ہمارے لیڈروں کی اسپیچ بازیوں سے اشتراکی بن جائے گا۔

انھیں یہاں بھی وہی کچھ کرنا پڑے گا جو روس میں کیا گیا اور تاوقتیکہ ہندوستان آزادی کامل نہ حاصل کرلے۔ روس کی بے باکانہ اور سفاکانہ روش نہیں اختیار کرسکتا ہے۔ مزید براں اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے۔ کہ سبھاش بابو کی چھ مہینے والی دھمکی کارگر ہوگئی اور برٹش حکومت کا خاتمہ بھی ہوگیا تو کیا یہ قرین عقل ہے کہ اُس وقت ہندوستان بیرونی دشمنوں کا کچھ خیال کئے بغیر اشتراکیت کی ترویج شروع کردے گا۔ جبکہ یہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ جبر وتعدی ہی نہیں بلکہ خانہ جنگی کے بغیر یہاں اشتراکیت کے پاؤں جمتے نہیں نظر آتے۔

پھر سمجھ میں نہیں آتا۔ اس خواب پریشاں کے پیچھے اتنی اہم چیزیں یعنی ملک کی آزادی اور آپس کی رواداری کیوں پس پشت ڈالی جارہی ہیں۔ کیوں عوام کو دامِ فریب میں مبتلا کیا جارہا ہے۔ اور کیوں ایک بے بنیاد افسانے کی خاطر ایک تباہ کن خانہ جنگی کی داغ وبیل ڈالی جارہی ہے؟ میں پھر عرض کروں گا کہ اگر سوشلزم یا اور کوئی ازم ان کی غرض وغایت ہے تو اسی کو ذریعہ حصول سمجھ لینے کی غلطی نہ کریں اور مقصد اور ذریعہ حصول مقصد کا فرق سمجھیں۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ ظاہر ہوگیا ہوگا کہ ہندوستان اور روس کے حالات اتنے مختلف ہیں کہ وہاں کی تقلید ہندوستان کے لئے کبھی بھی مناسب نہیں ہوگی۔

یوں تو اشتراکیت کی تعریف میں صفحے کے صفحے رنگے جاسکتے ہیں لیکن ایک جملہ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اشتراکیت انفرادیت کی ضد ہے۔ انفرادیت میں شخص واحد ہی سب کچھ ہوتا ہے اور اپنے نفع اور نقصان کے لئے وہ آزاد ہوتا ہے کہ جو چاہے کرے اُس سے کوئی بازپرس کرنے والا نہیں ہے۔ بشرطیکہ اس کے حرکات وسکنات براہ راست دوسروں کے لئے مضرت رساں نہ ہوں۔ اس کے برعکس اشتراکیت مقتضی ہے کہ فرد واحد کی شخصیت جماعت میں جذب ہوجائے۔ افراد سے زیادہ جماعت کے نفع ونقصان کا خیال رکھا جائے اور زیادہ سے زیادہ اختیارات معاشرے کے ہاتھ میں دے دئے جائیں کہ یہ مجموعی طور پر افراد کی ضروریات کو بطریقہ احسن انجام دے سکے۔

سوشلزم یا اشتراکیت بہت وسیع معنی کا لفظ ہے اس کا اطلاق جس طرح روس کے محدود کمیونزم پر ہوسکتا ہے اُسی طرح جرمنی اور اٹلی کے ناززم اور فاشزم پر بھی ہوسکتا ہے۔ یہی کیوں آسٹریلیا۔ کنیڈا۔ جنوبی افریقہ ہی نہیں بلکہ انگلستان۔ فرانس اور امریکہ تک کو غیر اشتراکی نہیں کہہ سکتے۔ موجودہ زمانہ میں اشتراکیت سے پرہیز قطعی ناممکن ہے۔ تہذیب وتمدن اور اقوامِ عالم کے عروج وزوال کی تاریخ پر ایک بے لاگ اور عمیق نظر ڈالنے سے اس نتیجہ پر پہونچے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ دنیا تدریجی رفتار سے اشتراکیت کی طرف بڑھتی چلی جارہی ہے۔ انفرادیت دن بہ دن روبہ انحطاط ہے۔ فطرت کے اولین انسان کی مہیب انفرادیت کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے ہزار دو ہزار بلکہ صدی دو صدی کے معاشرے کا موازنہ اگر آج کے معاشرے سے کیا جائے تب بھی انفرادیت پر اشتراکیت کا تصرف بیّن طور پر نمایاں ہوجائے گا۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ایک ہی صدی کے اندر دنیا کی ریاستوں میں جو انقلابات ہوگئے ہیں ان کا جائزہ لیجئے

یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ ہماری روز کی زندگی پر غیر محسوس طور پر ریاست کا قبضہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور تمام وہ اُمور جو کچھ دن قبل ہمارے ذاتی اختیار و اقتدار میں تھے ریاست کے تصرف میں آئے جاتے ہیں۔ انگلستان اور امریکہ ہی پر اس خیال کو دماغ میں رکھ کر ایک غیر متعصبانہ نگاہ ڈالی جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ یہ ممالک بھی کتنے اشتراکی ہو گئے اور کس تیزی سے اشتراکیت کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور اس کے بعد حضرات سوشلسٹ کی صدائے بے ہنگام پر ماتم کیجئے کہ باوجود اپنے دعووں کے یہ نفس سوشلزم سے کس قدر دور ہیں۔ ان کے نزدیک ایک سوشلسٹ حکومت کا قیام ہی سب کچھ ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ تاوقتیکہ تدریجی رفتار سے کسی چیز کی ترویج نہ ہو اس کے نتائج کتنے برے ہوتے ہیں۔ قیام بولشوزم کے بعد روس کی اندرونی سازشوں، بغاوتوں، حکومت کی سخت گیریوں اور خون ناحق کی تہ تک یہ حضرات اب تک نہیں پہونچ سکے ہیں۔ شاید ان کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ بہ نسبت روس کے اشتراکیت نے فرانس، امریکہ اور انگلستان میں ترقی کے منازل زیادہ طے کئے ہیں اور ان ممالک میں اس کا مستقبل زیادہ روشن ہے۔

اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ دنیا دن بہ دن اشتراکی ہوتی چلی جا رہی ہے اور انفرادیت کا میدان عمل کم ہوتا چلا جا رہا ہے لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ کیا کوئی دن ایسا بھی آنے والا ہے جب انفرادیت کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا اور اس کی جگہ انتہائی درجہ کی اشتراکیت یعنی اشتمالیت لے لیگی اشتمالیت یہ ہے کہ فرد اپنے جملہ امور کو جو اس کے بقائے حیات کے لئے ضروری ہیں ریاست کے حوالہ کر دے اور ریاست اپنے سر اس کے ضروریات زندگی کی کفالت کی ذمہ داری لے لے بہ الفاظ دیگر اشتمالیت ریاست اور فرد کے درمیان ایک معاہدہ ہے۔ جس کی رو سے فرد اپنی کل کائنات نیز ذاتی خدمات بھی ریاست کے حوالہ کر دیتا ہے۔ اس کے بدلے ریاست ذمہ لیتی ہے کہ وہ افراد کی ضروریات زندگی کو پورا کرے گی فاقہ کشی کی نوبت نہ آنے دے گی۔ بے روزگاری کا خاتمہ کر دے گی۔ امیر و غریب، آقا و غلام کی تفریق مٹا دے گی۔ اور اب سوال یہ ہے کہ کیا رفتہ رفتہ اس قسم کی اشتمالیت انفرادیت کے کھنڈروں پر آباد ہو جائے گی؟ اس کا جواب تو وہی ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ انفرادیت اشتراکیت کی ضد ہے اور یہ امر مسلمہ ہے کہ کسی چیز کے بقا و قیام کے لئے اجتماع ضدین بہت ضروری ہے۔ ایک ضد کا عدم دوسرے کے فنا کا بھی پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ ایک دوسرے پر قائم ہے۔ بغیر رات کے دن کا تصور بھی محال ہے کہنے والے تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ اگر شیطان نہ ہوتا تو خدا تک اپنی خدائی کا اظہار نہ کر سکتا۔

اشتمالیت میں فرد واحد کی شخصیت بالکل محو ہو جاتی ہے اور اس کی حیثیت ایک مشین کے پرزے سے کچھ زیادہ نہیں رہ جاتی نہ تو اس کا اپنا دماغ رہ جاتا ہے اور نہ اپنے اقوال و افعال۔ دوسرے کے سکھائے سیکھتا ہے اور دوسرے کے چلائے چلتا ہے۔ اس کی اپنی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ نہ اپنا کوئی مقصد ہوتا ہے جس کے حصول کے لئے جد و جہد کرے اور نہ کوئی منزل ہے جس کے لئے مردانہ وار قدم بڑھائے۔ جیتا ہے تو دوسروں کے لئے مرتا ہے تو غیروں کے لئے۔

غرض انسانیت اُس سے رخصت ہو جاتی ہے اور غریب ولی ہو کے رہ جاتا ہے۔ معاشرہ ہے کہ اُس انجن کی طرح جس کا کوئی انجنیر نہیں حرکت کئے چلا جا رہا ہے۔ جس کے پاس بقائے حیات کے لئے نہ تو کوئی جد و جہد ہے اور نہ آیندہ ترقیوں کے لئے تدابیر و ذرایع۔ وجہ اس کی صرف اتنی ہے کہ معاشرہ کی شخصیت تو یہی ہے کہ وہ افراد پر مشتمل ہے۔ اور جب افراد ہی سے احساس خودی رخصت ہوگئی تو معاشرہ میں کہاں سے آجائے گی؟ اور ظاہر ہے کہ جب افراد کے قوائے عقلی اسی طرح معطل کر دئے جائیں تو اس کا اثر خود معاشرہ پر کیا نہیں پڑے گا؟ کیا پوری جماعت اس بربادی سے گھاٹے میں نہیں رہے گی اور کیا انسانیت کے لئے یہ پیام موت نہیں ہوگا؟

اشتراکیت کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ ہر فرد بشر اپنی خودی کو بالائے طاق رکھ کر خود کو دوسروں کا خادم بنا دے تصور تو یقیناً بہت پاکیزہ اور بلند ہے۔ اتنا بلند کہ خود انسان ابھی اس سے منزلوں نیچے ہے اور بہت ممکن ہے کہ وہاں تک پہونچتے پہونچتے خود انسانیت ہی اس کا ساتھ چھوڑ دے۔

لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انسان اس طرح بے خود ہو کر حضرت عیسیٰ یا مہاتما بودھ ہو بھی گیا تو دیکھنا یہ ہے کہ اس کا اثر خود معاشرے پر کیا ہوگا۔ جون سٹوارٹ مل نے اپنے شہرۂ آفاق مقالے آزادی میں اس کا جواب دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اشتراکیت کے دلدادوں کو مارکس کے مطالعہ سے کب فرصت ہے کہ اس دنیا کی باتیں کریں سیاسی اور معاشیاتی پہلو سے قطع نظر ظاہراً تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آج تک دنیا نے جتنی ترقیاں کیں سب انفرادیت کے کرشمے ہیں۔ جتنے ایجادات و اختراعات ہوئے سب کے پس پردہ یہی قوت کارفرما تھی اور انسان جو آج زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا ہے سب اسی کی برکتوں کا فیض ہے اور اب کیسے یقین کر لیا جائے کہ ابتدائے آفرینش سے دنیا جس راستے پر گامزن ہی رہی یکایک اس کے بالکل برعکس چلنے لگے گی۔ یہ تو درست ہے کہ زمانہ ایک ہی رفتار پر برابر نہیں چلتا رہتا ہے۔ لیکن یہ بھی اتنا ہی قطعی ہے کہ وہ کبھی بھی اتنا نہیں بہک سکتا کہ ماضی کو بالکل فراموش کر دے۔ اگر معاشرے کو برقرار رکھنا ہے تو فرد کی علحدہ شخصیت بھی قایم رکھنی پڑے گی۔ اگر جماعت کی ترقیوں کو جاری رکھنا ہے تو فرد واحد کی ذاتی منفعت اور مضرت کی ذمہ داری ایک حد تک فرد ہی کے ہاتھوں چھوڑ دینی پڑے گی۔ بڑے لوگوں سے ہمیشہ یہی غلطی ہوتی آرہی ہے کہ اعتدال کے دامن کو چھوڑ کر وہ ہر اہم مسئلہ کو انتہا تک لے آئے ہیں دوسرے علوم میں اس انتہا پسندی سے پہلے ہی چشم پوشی کی جائے۔ لیکن اجتماعیات میں اس سے انحراف ایک مہلک فروگزاشت ہے۔ انسان نہ تو ایک مشین ہے اور نہ ایک خودرو پودا اور میکانکی نظریوں کی سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ ان کے حامی جادۂ اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں ورنہ دونوں نظریوں کی بنیاد صداقت و حقیقت پر مبنی ہے اور ایک حد تک دونوں فطرتِ انسانی کے ترجمان ہیں۔

یہی حال انفرادیت اور اشتراکیت کی بحث کا بھی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم اشتراکیت کی طرف بڑھ رہے ہیں

لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ہم کسی دن اتنے اشتراکی ہو جائیں کہ انفرادیت کا بالکل خاتمہ ہو جائے۔

گلاب چند

(**نگار**) مقالہ نگار نے اس مضمون میں اشتراکیت کی مخالفت کی ہے اور میں نے اسے نگار میں صرف اس لئے شایع کیا ہے کہ جب تک کسی مسئلہ کے متعلق ہر مخالفانہ پہلو کو سامنے رکھ کر لوگوں کے دلوں سے ہر ممکن خدشہ کو دور نہ کر دیا جائے، ہم اسے مقبول عام نہیں بنا سکتے۔

میں اشتراکی ہوں، نگار کا مسلک اشتراکیت ہے اور میں پورے یقین کے ساتھ یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ انسانیت کی نجات اشتراکیت ہی میں پنہاں ہے اور وہ زمانہ آنے والا ہے، جب ساری دنیا اسی طرف کھنچ کر آ رہے گی، لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کو بہ جبر کسی کے سر تھوپا نہیں جا سکتا اور تا وقتیکہ ہم لوگوں کے دلوں میں اس کی صداقت کی طرف سے یقین کی کیفیت نہ پیدا کر دیں اس کی ترویج ممکن نہیں۔

اس وقت اشتراکیت کے مخالف تین گروہ ہیں، ایک سرمایہ دار دوسرے اہل مذاہب اور تیسرے وہ جو آمرانہ ذہنیت رکھتے ہیں اور اپنے تقدم شخصی کو ہاتھ سے جانے دینا گوارا نہیں کر سکتے۔

سرمایہ دار کی مخالفت تو ظاہر ہے کہ وہ یہ کیونکر گوارا کر سکتا ہے کہ اس کی جمع کی ہوئی دولت جس کا بڑا حصہ اس کے ناجائز عیش و تنعم میں صرف ہوتا ہے اور جس کے طفیل وہ غریب مزدوروں پر حکومت کرتا ہے ہاتھ سے نکل جائے، مذاہب نے اب جو صورت اختیار کر لی ہے، وہ بھی چونکہ ایک نوع کی سرمایہ داری ہے انکی مخالفت بھی ظاہر ہے، رہے آمرانہ ذہنیت رکھنے والے سو اُن کو اختلاف کرنا ہی چاہئے کیونکہ استبداد و اشتراکیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

مخالفین اشتراکیت کی سب سے بڑی دلیل ایک یہ ہے کہ اشتراکیت، اصول فطرت کے خلاف ہے۔ فرق مراتب قدرت کی پیدا کی ہوئی چیز ہے اور یہ دنیا سے محو نہیں ہو سکتی، لیکن یہ دلیل سراسر فریب ہے کیونکہ اشتراکیت فرقِ مراتب مٹانے کا نام نہیں ہے اور نہ ساری دنیا کی ذہنیت کو ایک کر دینے کا، بلکہ اشتراکیت کا مدعا دولت کو اس طرح بانٹ دینا ہے کہ دنیا سے فقر و فاقہ کی بلا دور ہو جائے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ خدا کا مقصود اپنے بندوں کے پیدا کرنے سے یہ بھی ہو کہ ان میں سے بعض کو اسراف کی حد تک دولت دیدی جائے اور بعض کو گدائی کی حد تک مجبور کر دیا جائے۔ اگر دنیا کے اخلاقی قوانین الہامی چیز نہیں ہیں بلکہ سوسائٹی کے تجربات سے پیدا ہوئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری معاشی و تمدنی دشواریاں آخر کار ہم کو کسی ایسے قانون کے بنانے پر مجبور نہ کریں۔

جن سے ان دشواریوں کا ازالہ ہو جائے اور اس بات کو تو اشتراکیت کے دشمن بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اشتراکیت کا مقصود انھیں اقتصادی پیچیدگیوں کو دور کرنا ہے۔ لیکن اس کو وہ قابل عمل نہیں سمجھتے اور اس لئے فیصلہ کا انحصار اس پر رہ جاتا ہے کہ اشتراکیت قابل عمل ہے یا نہیں۔ فاضل مقالہ نگار نے ہندوستان کو سامنے رکھکر زیادہ تر اس پہلو پر زور دیا ہے اور اُن کے نزدیک یہاں کے حالات اس کے موافق نہیں ہیں۔ ایک حد تک میں بھی اس کا موید ہوں، لیکن اس کے معنے یہ نہیں کہ اس تحریک کو بند کر دیا جائے کیونکہ اس صورت میں ہم کسی وقت بھی حالات کو اس کے موافق نہ بنا سکیں گے اور ہندوستان ہمیشہ غیروں کی گرفت میں رہکر اسی طرح فقر و فاقہ کی مصیبت میں مبتلا رہے گا۔

یہ بالکل درست ہے کہ اگر آج انگریز ہندوستان کو چھوڑ کر نکل جائے تو ہم کسی ملک کے حملہ کا جواب نہیں دے سکتے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی اور اس پر قابض ہو جائے گا، لیکن اشتراکیت پسند جماعت شاید اس قدر احمق نہیں ہے کہ وہ اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے۔ اس کا مطالبۂ آزادی اگر اصول اشتراکیت پر مبنی ہے تو اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ وہ انگریزوں سے نفرت کرتا ہے یا اُن کو یہاں سے بالکل نکال دینا چاہتا ہے، بلکہ اس کا مقصود صرف یہ ہے کہ اصول حکومت اشتراکی قرار دیا جائے، یہاں کی دولت یہیں رہے اور یہاں کے انسان، یہاں کی پیداوار اور یہاں کی ذہنیت سے اس طرح کام لیا جائے کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت آپ کر سکے۔ یہاں آدمیوں کی کمی نہیں، معدنیات کا فقدان نہیں، جسمانی و ذہنی قوت مفلوج نہیں، اگر کمی ہے تو صرف اس بات کی کہ ان سے کام نہیں لیا جاتا اور یہ کام نہ لیا جانا بدستور اسوقت تک قایم رہے گا جب تک ملک پوری طرح آزاد نہ ہو اور صنعت و حرفت تجارت و زراعت حکومت کے ہاتھ میں نہ آ جائے، کہ دولت کی صحیح تقسیم کی صورت صرف یہی ہے۔

مقالہ نگار کا یہ اعتراض کہ اشتراکیت میں انفرادی خصوصیات مٹ جاتی ہیں اور اُن کے اُبھرنے کا موقعہ نہیں ملتا، صحیح نہیں۔ روس کو دیکھئے کہ وہاں کونسا شعبۂ علم و فن ایسا ہے جو ترقی نہ کر رہا ہو۔ دور اشتراکیت میں وہاں جتنے بڑے سائنس داں اور ماہرین فنون پیدا ہوئے ہیں، دور قیصریت میں ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔

اشتراکیت پر یہ الزام قایم کرنا بھی غلط ہے کہ وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتی ہے، اشتراکیت کا مقصود یہ ہے کہ ہر شخص کی اہلیت سے پوری طرح کام لیا جائے اور اس کی جملہ ضروریات زندگی فراہم کرنے کی ذمہ داری حکومت اپنے سر لے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ ایک معمولی مزدور اور ایک اچھے ڈاکٹر کی ضروریات زندگی میں کیا فرق ہے اور وہ اس کا پورا لحاظ رکھتی ہے، اگر وہ یہ دیکھتی ہے کہ ایک شخص بغیر موٹر رکھے کام نہیں کر سکتا تو اسے پیدل چلنے پر مجبور نہیں کرتی، لیکن جذبۂ عیش و تنعم کو ضرور فنا کر دینا چاہتی ہے کہ اخلاق و انسانیت کے انحطاط و زوال کا تنہا سبب دنیا میں یہی ہے۔

یہ درست ہے کہ جمہوریت کی کیسی ہی وسیع صورت فرض کر لی جائے، آمریت بدستور قایم رہیگی، روس میں اگر

لینن نہیں رہا تو اسٹالین موجود ہے۔ لیکن سوال ہمیشہ اصول کا ہوا کرتا ہے اور اسی کی صحیح تعیین اشتراکیت کا نصب العین ہے۔ گو اسٹالین آمرانہ حیثیت رکھتا ہے لیکن وہ زار کبھی نہیں ہو سکتا۔ زار کے باورچی خانہ کا خرچ لاکھوں روپیہ تھا اور اسٹالین صرف ساٹھ روپیہ لیتا ہے۔ پھر اگر استبداد و آمریت کا یہ فرق معمولی فرق نہیں ہے تو محض اصطلاح پر لڑنا جھگڑنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ انسانیت پر جو مظالم ہو رہے ہیں وہ کیونکر دور ہو سکتے ہیں۔ ملوکیت و استبداد کا تجربہ ہو چکا، مذہب و کلیسا کا دور بھی دیکھ لیا گیا، سرمایہ دارانہ حکومتوں اور ڈماکریسی کے نام سے عیاشیاں کرنے والی سلطنتوں کا حال بھی ہمیں معلوم ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ان سب سے علحدہ ہو کر کوئی اور نئی صورت نہ سوچی جائے اور اسوقت وہ نئی صورت سوائے اشتراکیت و اشتمالیت کے اور کوئی نہیں ہے۔ اگر تجربہ سے یہ بھی ناکام ثابت ہوئی تو کوئی اور راہ دیکھی جائے گی۔ زمانہ کے ساتھ ہمارے داعیات بدلتے رہتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ایک وقت وہ آئے جب اشتراکیت بھی ناکافی ثابت ہو اور بکل عدمیت کی طرف رجوع کیا جائے۔

جب ایک قوم میں انحطاط پیدا ہوتا ہے تو اس کی ذہنیت یہی ہو جاتی ہے کہ وہ ہر اقدام سے ڈرنے لگتی ہے اور اپنے مستقبل کو وہ نہایت مایوسی کی نگاہ سے دیکھتی ہے حالانکہ اپنے آپ کو طوفان میں ڈالدینا ہی ساحل تک پہونچنا ہی اور

در بلا بودن بہ از بیم بلاست

آپ کے فایدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علحدہ علحدہ خرید فرمائیں گے تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ بریں۔

نگارستان	جمالستان	ترغیبات جنسی	شہاب کی سرگزشت	استفسار و جواب ہر سہ جلد
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	نو روپیہ
معرکۂ سخن	مکتوبات نیاز	اردو شاعری	ہندی شاعری	میزان کل
ڈھائی روپیہ	ڈھائی روپیہ	دو روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	ستائیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپیہ میں ملجائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

منیجر نگار لکھنؤ

عزیز لکھنوی کی غزل گوئی

اُردو غزل گوئی کی ترقی و ارتقا کی تاریخ میں عزیز کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جس مرکز پر وہ ہیں وہاں نہ صرف بہت سی راہیں ختم ہوتی ہیں بلکہ بعض نئی راہیں بھی کھلتی ہیں۔ اس لئے عزیز اپنی جگہ صفِ اول کے غزل گو قرار دئے جاسکیں یا نہیں لیکن تاریخ نے ان کی حیثیت سنگ میل (mile stone) کی بنادی ہے جسے سفر کرنے والے کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ آرٹ اور ادب کی دنیا کو ایک یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہاں کوئی چیز ایک شہاب ثاقب (meteor) کی طرح نظروں کے سامنے آکر اوجھل نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اس دُنیا کی ہر سحر میں ایک نئی شام اور ہر شام میں ایک نئی سحر کا انتظام ہوتا ہے۔ ورڈسورتھ، کیٹس، شیلے، بائرن حادثاتِ زمانہ کا کوئی شعبدہ نہ تھے۔ بلکہ انکے لئے ایک راہ تیار کی گئی تھی اور اس راہ کے کمل ہو جانے پر ہی ان کا وجود ممکن ہو سکا۔ یہ راہ تیار کرنے والے کون تھے؟ یہ کوئی راز کی بات نہیں۔ گرے۔ کولنس۔ برنس۔ بلیک معروف نام ہیں۔ اُردو غزل گوئی میں کچھ یہی مرتبہ عزیز کو حاصل ہے۔ ان کا کلام آئینہ ہے ان تمام خصوصیات تغزل کا جو قدیم غزل کے تصور میں شامل تھیں۔ ان کا کلام خاکہ ہے ان خطوں سے مرتب جو آگے بڑھکر جدید رنگ تغزل کی تصویر کہلائے اور ان کا کلام نمونہ ہے جدید تغزل کی ان گوناگوں دلچسپیوں کا جس پر آج ہم لوگ بجا طور پر نازاں ہیں۔

قدیم تغزل مژگاں کے تیر۔ دل و جگر کے ٹکڑے۔ رقیب کے شکوہ، محبوب کی سرد مہری، ہجر کے صدمے، وصل کی ہوس، موت کی بیماری اور اس کے باوجود آنے والے کے انتظار میں نہ مر سکنے کی نوع کے جزئیات سے مرتب تھا۔ میں نے اسوقت تک قدیم تغزل کے سلسلہ میں دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے درمیان کوئی خطِ امتیاز نہیں کھینچا ہے۔ لیکن اسوقت یہ کہدینا مناسب سمجھتا ہوں کہ جسوقت لکھنوی شعراء نے اپنے تغزل کی مصنوعیت (Artificiality) سے بیدار ہو کر جذباتی ضرورتوں کو محسوس کیا تو غزل کو اچھا خاصہ مرثیہ بنا دیا۔ ان کے نزدیک وہ غزل غزل ہی نہ تھی جس میں شاعر نے ایک بار دردنہ ہو یا وہ خون کے آنسو نہ روئے یا اس پر نزع کا عالم طاری نہ ہو یا چارہ گری نہ فرمائی جائے یا محبوب موت کا پیغام بنکر وارد نہ ہو۔ عزیز کے یہاں دہلی اسکول کی بیکسی اور لکھنؤ اسکول کا مرگھٹ پن دونوں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ دیوانہ سازی و دیوانہ گری کے انداز بھی وہی ہیں اور آداب محبت اور ان کے

جزئیات میں بھی وہی ہمواری موجود ہے۔ سنئے :۔

یہ کہہ کے سرہانے سے وہ بیمار کے اُٹھے — صد شکر کہ مجھ پر کوئی الزام نہ آیا

نثار اس بچپنے کے اور اس نازک دماغی کے — سیہ بالوں سے اپنے نیند میں خود آپ ڈر جانا

ذکر مزاج ناز کرو مشورہ یہ ہے — وقت اخیر نبض کی رفتار دیکھکر

مانا کہ ہے حضور کی چپٹکی منجی ہوئی، — دل بے خطا ہے ہوگی خطا اس نشانے میں

ملے ہیں جبکہ دونوں دل تو آخر شرم سے حاصل — تکلف برطرف ہے جب تو پردہ درمیاں کیوں ہو

مریض غم کو اپنے ہاتھ سے تم زہر ہی دیدو — اک اسکے دم سے عاجز اسقدر سارا جہاں کیوں ہو

قتل اور مجھ سے سخت جاں کا قتل، — تیغ دیکھو ذرا کمر دیکھو ،،

دل میں پیوست ہے اک تیر نکالوں کیونکر — ڈر رہا ہوں کہ نگاہِ غلط انداز نہ ہو

اے حنائے دست قاتل دیکھکر قسمت تری — رشک سے کرنا پڑا آخر لہو پانی مجھے،

کہیں وعدہ بھی کریں وہ کہ ذرا قرار آئے — کہیں ختم زندگی ہو شب انتظار آئے

ملنے کو تو میں حضرتِ ناصح سے ہاں ملا، — لیکن ہنسی بھی وقتِ ملاقات آگئی،

لیکن مندرجۂ بالا اشعار سے یہ نہ سمجھا جائے کہ قدیم تغزل یکسر اسی اساس پر قایم تھا۔ یہ ضرور ہے کہ پیش منظر کے خط وخال اکثر یہی رنگ لئے ہوئے ہیں۔ عزیز کے کلام سے جو اشعار پیش کئے گئے ہیں وہ رنگِ غالب کا درجہ نہیں رکھتے تاہم پسِ منظر (Back ground) ہیں افق کی سیاہی کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں۔

ان سے زیادہ دلچسپ اور اہم وہ اشعار ہیں جو اپنی اصل ونسل کے اعتبار سے اسی شاخ کے برگ وبار ہیں جس کا ابھی ابھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ لیکن عزیز نے ان میں وہ تراش وخراش پیش کی ہے جو اپنا نمونہ آپ ہے چنانچہ اس منزل پر آکر محبوب ایک اچھا خاصہ انسان اور انسانی جذبات کا حامل ہو جاتا ہے اور بجائے اپنے مریض غم کو تغافل بیجا کا شکار بنانے کے وہی سلوک کرتا ہے جو ایک ہمدرد دوست کو کرنا چاہئے۔

ان کی اس کوشش بیجد کا پتہ دیتا ہے — چارہ سازوں کا مری لاش پہ گریاں ہونا

اس کے علاوہ زندگی میں عاشق کو پورا احساس تھا کہ اس کا محبوب پتھر کا ایک مجسمہ نہیں ہے۔ اس لئے اپنے معاملات میں احتیاط سے کام لیتا ہے

ڈرتا ہوں دل کا حال بیاں تم سے کیا کروں — تم ایسے زود رنج کا ہے اعتبار کیا

محبوب عاشق کی موت کے بعد قبر پر جانے سے نہیں چڑھتا۔

مری قبر پہ وہ شاید کبھی آ گئے ہیں ورنہ — یہ ہجوم اہل دل کا نہ سر مزار ہوتا

رقیب ہمیشہ تکلیف دہ قوتوں کا مرکز سمجھا گیا۔ لیکن عزیز اسے بھی قدرے خوشگوار روشنی میں پیش کرتے ہیں۔

کہتے ہیں وہ رقیب سے افسانۂ کلیم مجھ کو ہلاک حسرت دیدار دیکھکر

اسی طرح ناصح کو شاعروں کی بزم کا مسخرہ (Clown) تصور کیا جاتا تھا۔ عزیز اس مخلوق کو بھی متانت کا حقدار سمجھتے ہیں۔

ہے سر تا قدم سادہ لوحی کا نقشہ غنیمت زمانے میں ناصح کا دم ہے

انگریزی میں ایک محاورہ ہے " To give the devil his due " عزیز نے نادانستہ طور پر یہی فرض ادا کیا ہے۔

کاروبار محبت میں "وعدہ" کے زور پر کیا کیا ہوائی قلعے نہیں بنتے۔ لیکن عزیز حقیقت کو سمجھ گئے اور وہ بھی کس انداز سے

ترے وعدہ کی حقیقت کو ہمیں سمجھ رہے ہیں وہ حریص زندگی ہے جسے اعتبار آئے

بارگاہ حسن میں "شہادت" عاشقی کی معراج ہے۔ چنانچہ کوئی تعجب نہیں اگر سر کٹانے کے شوق میں مقتل میں بھی ایک عالم جمع ہو جائے۔ لیکن عزیز نے ایک "نفسیاتی" بات درمیان میں لاکر بات کو کچھ اور کر دیا ہے۔

کون مقتل میں کسی سے بھی مشتاق شہادت ہوں یہاں سب خود غرض ہیں کون کس کے کام آتا ہے

"یہاں سب خود غرض ہیں" کی داد نہیں دیجا سکتی۔

پند و نصائح (Didacticism) بھی قدیم تغزل کی روایات میں ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں گو یہ چیز ہمیشہ تغزل سے خارج سمجھی گئی تاہم ہر اچھے اور برے شاعر نے غزل میں نفس کی ہوسناکی۔ سخت کلامی، بے ثباتی عبرت اور دیر و کعبہ کے بے سود تنازعات پر اشارے کئے ہیں۔ عزیز نے یہاں بھی حق تقلید ادا کیا ہے لیکن یہ تقلید کورانہ تقلید نہیں کہی جا سکتی۔ عزیز نے یہاں بھی ایک قسم کا نکھار پیدا کر دیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ عزیز اس باب میں "ہمت و حوصلہ" کی حد تک جدید معیار حاصل نہ کر سکے۔ احساس کی پستی لکھنؤ اسکول کے اس دور کی خصوصیت رہی ہے جو (Emotional Renaissance) جذبات نوازی سے وابستہ ہے۔ چنانچہ عزیز بھی ان حدود سے باہر آ سکے۔

بیداد بات کر کے تجھے روئیں دوسرے رونا خود اپنے حال پہ یہ زار زار کیا ✓

اپنی ہی ذات میں خود اس کا نظارہ ہوتا ہجر میں ہم نے اگر نفس کو مارا ہوتا

نازک دلوں کو سخت زبانوں سے ہے گریز شبنم کو کب قرار رہا نوک خار پر

جاگنے سے فائدہ اے عابد شب زندہ دار کچھ نہیں ہے روح میں جب تک کہ بیداری نہیں

فرصتِ زیست کم ہے کام بہت
کل جو کرنا ہے ہم کو آج کریں

ہو استفادہ ہے یہی ہستی کا اقتضا
حاصل جہاں سے کیجئے عبرت ہی کیوں نہ ہو

دیر و کعبہ میں فرق کیا ہے عزیز
صرف پابندیاں ہیں مذہب کی

لیکن جس حد تک بھی عزیز لکھنوی غزل گوئی کے بگڑے ہوئے خط و خال کو سنوار سکے ہیں وہ ہر کسی کا کام نہیں بجز ایک سلجھی ہوئی طبیعت، تربیت یافتہ دماغ اور ناقدانہ رجحان اس بارے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ عزیز کے ساتھ جس منزل پر ہم یہاں پہونچے ہیں، وہاں معلوم ہوتا ہے کہ مریض کو نزاعی کیفیت کے بجائے وہ سکونِ خواب حاصل ہے جس میں، ہر سانس زندگی بنکر لوٹتی ہے۔

آئیے، عزیز کے کلام سے اب وہ نمونے منتخب کریں جو اگر قطعاً جدید رنگ کے حامل نہیں تاہم قدیم رنگ تغزل کے خلاف کھلا ہوا اعلانِ جنگ ہیں۔

ہے ان کی بزم میں ہر شخص اپنے عالم میں
کسی کا حال کسی پر عیاں نہیں ہوتا
اک ان کا دل ہے کہ دم بھر ہنسی نہیں رکتی
اک اپنا حال کہ ضبطِ فغاں نہیں ہوتا

ہاتھ بڑھنا تھا کہ رگ رگ میں لہو دوڑ گیا
پھر وہی مرحلۂ چاکِ گریباں نکلا،
خودکشی سے بھی ہوئی کار برآری نہ عزیز
سہل جو کام تھا وہ بھی تو نہ آساں نکلا،

اُسوقت عشق محو تھا اپنے ہی جلوے میں
جب حسن خود نہ زینتِ بزمِ وجود تھا،

کون ہے تیرے سوا روحِ روانِ ہستی،
تو نہ ہوتا تو بھلا کون [illegible]

فصلِ بہار تیری اللہ رے معنویت!
ذروں کا وہ نکھرنا، مٹی کا وہ سنورنا

اعتبارِ عشق نے یکسو نگاہوں کو کیا
وہ بھی حیراں ہو گئے ہیں مجھکو حیراں دیکھ کر

کچھ لوگ اجنبی سے رستہ بتا رہے ہیں
زنداں سے میں چلا ہوں اُجڑے ہوئے وطن میں

دو جہاں میں نہیں رہتا ہے ٹھکانہ جن کا
ان اسیروں کو وہ آزاد کیا کرتے ہیں

ہم ہیں اور بالیں پرستی ہم ہیں اور اعضا شکنی
اب وہ پہلی سی ہماری سعی لاحاصل نہیں

میں حقیقت کو سمجھ کر تیری دیوانہ بنا
یوں بھی عالم میں کسی کا رازداں کوئی نہ ہو

یہی اک پردۂ تصویر بنانے کے قابل تھا
کہ آنسو گرتے ہی دامن پہ صورت کھینچ گئی دل کی

تمام روح کی لذت اسی پہ تھی موقوف
کہ زندگی میں کبھی تم سے گفتگو کرتے

ابھی پیوست ہے کافر نگاہ شوخ ادا ان کی
کسی دن دیکھنا بجلی گراؤں گا اسی دل سے

اللہ! اللہ ذہنی ترقی وارتقا بھی کیا چیز ہے۔ دیکھئے ان اشعار میں دنیا کا ہر قانون بدلا ہوا ہے۔ شاید

حلقہ ہائے زلف میں تحریک دیوانگی تھی اب گل ولالہ کی معنویت اس کی محرک ہے۔ پہلے شاعر زہر کی بھیک مانگتا تھا اب خودکشی کا حوصلہ رکھتا ہے۔ پہلے لوگ سودائی تھے گوشت پوست کے ایک لوتھڑے کے۔ اب ان کی نظر "روحِ روانِ عالم" تک پہونچتی ہے۔ پہلے پتھر کے ٹکڑے آئینہ حیرت تھے، اب "اعتبار عشق" بھی ایک قوت بن گیا پہلے لوگ دیوانہ بنتے تھے، قیس و فرہاد کی جانشینی کے علمبردار بن کر لیکن اب دیوانہ بنتے ہیں اس لئے کہ رگ جاں پر کوئی نشتر زن ہو کر کہتا ہے کہ "تم میرے دیوانے بنو!" گویا یوں سمجھ لیجئے کہ پہلے شاعر کو واسطہ تھا جسم سے مگر اب روح کی قوت بھی اسے محسوس ہونے لگی ہے۔ پہلے شاعر کی نگاہ محدود تھی صرف روزمرہ کی زندگی اور اس کے عمومی جزئیات پر لیکن اب اُس کی نظر زندگی کی حقیقتوں پر ٹھہرتی ہے۔ پہلے شاعر اس دنیا کے تجربوں پر قانع تھا جسے خلوت وجلوت کی چہار دیواری کہا جا سکتا ہے لیکن اب ایک پوری کائنات اُس کی محفل ہے۔

کہا جاتا ہے عزیز کا یہ ذہنی ارتقا غالب کی تقلید کا مرہون منت ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں کو در پردہ اصرار ہے کہ عزیز کو غالب کا صحیح مقلد اور ہمصفیر مانا جائے۔ لیکن مجھے اس گمان میں حسنِ ظن کی جھلک نظر آتی ہے۔ اگر غالب کی تقلید کے یہ معنی ہیں کہ ہر بات کو ایک معمہ بنا کر پیش کیا جائے تو عزیز ایک حد تک غالب کے مقلد کہے جا سکتے ہیں۔۔

جفائے ناز بتقریبِ رسمِ اُلفت ہے — یہی ہے خیر ابھی امتحاں نہیں ہوتا

ہے بہم ترجیح سودائے مژہ پر ردِ قدح — ہر رگِ دل دے رہی ہے نوکِ نشتر کا جواب

سلسلہ جوہرِ شمشیر کا تھا مانعِ دید — ہر نظر تھی مری پابندِ سلاسل قاتل

مژگاں کو شغلِ ماتمِ ناکامیِ نگاہ — آنکھیں جھپک رہی ہیں تری جلوہ زار میں

لیکن اس تقلید کی مثالیں استثنا کی حد تک کم ہیں۔ اب اگر غالب کی تقلید سے مراد ہے اس کے طرز بیان کی تقلید تو بھی یہ بات صحیح نہیں اترتی۔ غالب کا شعر ہے۔

رات اسکی ہے، دماغ اسکا ہے نیند اسکی ہے — تیری زلفیں جس کے شانے پر پریشاں ہو گئیں

عزیز کے یہاں اس اسلوب بیان کی تقلید صرف دو جگہ نظر آتی ہے۔

خیال انکا ہے، آشفتہ سری انکی جنون انکا — جو دیوانے قریبِ دامنِ کہسار بیٹھے ہیں

انتظار اسکا خیال اسکا، امید اسکی نہ پوچھ — صبح سے شام ترے در پہ جو کر دیتا ہے

رہا غالب کی تخئیل اور اس کی تقلید کا سوال تو مجھے اس بات کی صحت میں ابھی شبہ ہے۔

عرضِ مطلب بہ تمنائے سکونِ دل ہے — وہ سنیں یا نہ سنیں ہم تو سنا جاتے ہیں

ابتک کچھ آشیاں کا سماں سا نظر میں ہے — گو میں قفس میں تازہ گرفتار بھی نہیں

اس قسم کے اشعار عزیز کے یہاں بس دو چار ہی ہیں اور غالب کا یہ رنگ۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی۔

پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی،
اب کسی بات پر نہیں آتی

تو کسی حد تک بھی عزیز کی قسمت نہ ہو سکا۔ غالب کا شعر ہے:-

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

عزیز جس حد تک "گھر یاد آنے" کی تخئیل سے حاصل کر سکے ہیں وہ صرف یہ ہے

غمکدہ اپنا کیا پھر ویراں
پھر مجھے آپ کا گھر یاد آیا

غالب کا ایک مشہور مقطع ہے:-

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

غالب کا تیکھا پن عزیز سے پیدا نہ ہو سکا اور شعر سچ مچ فقیر کی صدا بنکر رہ گیا۔ سنئے:-

درِ منعم پہ ہے مقصود گدائی کس کو
دلِ پر حوصلۂ اہلِ کرم دیکھتے ہیں

غالب کی تخئیل کو چھوڑئے۔ غالب کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی زبان میں وہ صحت اور چستی ہے جو الفاظ کو آدھی شاعری بنا دیتی ہے۔ اس کے خلاف عزیز نے جہاں غالب کی زبان کی تقلید کی ہے وہیں صحت سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔

بقدرِ جوشش جوانی بڑھا غرور ان کا
کرے نے نشہ باندازۂ خمار کیا

گویا شبِ فراق میں میں سر سے تا قدم
آئینۂ تحملِ ایذائے درد تھا

گرہ دل کی کھلی اک ناخنِ رگیں سے خوں ہو کر
ہمیں یہ طرزِ حل عقدۂ مشکل پسند آیا

آنکھیں ہیں بند خواب جوانی میں مست ہیں
پردہ کھنچا ہوا ہے حرمگاہِ ناز کا،

مجھ کو اس صفحۂ ہستی سے ہو گیا دلچسپی
جس کو تصویرِ خیالاتِ پریشاں سمجھا

✓ تھی مری ہستی بھی جب اک قطرۂ دریا نما
کیوں نہ ہم آغوش کرکے پھر مجھے دریا کیا

ہاں اے حریمِ قدس میں ہنگام گرم کن،
محفل کا رنگ دیکھ رہے ہیں یہیں سے ہم

خیال ان کا ہے آشفتہ سری ان کی جنوں انکا
جو دیوانے قریبِ دامنِ کہسار بیٹھے ہیں

دار فگانِ حسن پہ کیا جانے کیا بنے
اُٹھ جائیں گر نگاہ سے پردے حجاب کے

اُڑتی ہوئی یہ خاکِ پریشان یہ ہوا
تشریح ہے عزیز کے حالِ تباہ کی

مجھے مندرجۂ بالا اشعار میں "نشہ باندازۂ خمار" "ایذائے درد" "طرزِ حل عقدۂ مشکل" "حرمگاہِ ناز" "تصویر

خیالاتِ پریشاں،، "قطرۂ دریا نما" "ہنگام گرم کن،، "قریبِ دامنِ کہسار،، "پردۂ حجاب" – ان تمام تراکیب کی صحت پر شک ہے ۔ فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں ۔

لیکن اس بحث کا مدعا یہ نہیں کہ میں عزیز کی حیثیت پر داغ لگانا چاہتا ہوں ۔ بلکہ میرے نزدیک تو تقلید کا حامی ہونا اپنی انفرادی قوتوں اور اپنے فطری رحجانات کا خون کرنا ہے ۔ اس طرح کسی شاعر کو غالب کا ہمنوا یا ہمرنگ یا مقلد کہدینا بھی کوئی امتیاز نہیں ۔ عزیز، عزیز ہیں اس لئے کہ اُنھوں نے اپنا ایک انفرادی رنگ پیدا کیا نہ اس لئے کہ اُنھوں نے غالب کی تقلید کی ۔ زبان و تخئیل کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتیں ۔ اور ظاہر ہے کہ نہ عزیز کی تخئیل غالب کا اسلوب بیان قبول کر سکتی ہے اور نہ عزیز کا طرز کلام غالب کی تخئیل کو جگہ دے سکتا ہے ۔ غالب کے کلام میں ایک "جرأت مردانہ" ہے عزیز کے کلام میں نسائیت کا لوچ ان کی شاعری کی بنیاد بنا ہوا ہے ۔ پھر غالب عزیز کے یا عزیز غالب کے ہم صف و ہم رنگ کیونکر ہو سکتے ہیں اور جب یہ بات حاصل نہیں تو عزیز کو غالب کا ہمنوا بنانا ایک سعی لاحاصل کے سوا کچھ نہیں ۔ عزیز کے تخئیل کی نوعیت اور ان کے اسلوب بیان کی گنجایش ظاہر کرنے کے لئے ان کے یہ شعر کافی سمجھتا ہوں :-

ہر اک قدم ترے کوچے میں ایک عالم ہے
کہاں تک اب میں چلوں گا چلا نہیں جاتا

ہجوم شوق کا بس مختصر یہ قصہ ہے
کہ جو میں چاہتا ہوں وہ کہا نہیں جاتا

زبان دل کی حقیقت کو کیا بیاں کرتی
کسی کا حال کسی سے کہا نہیں جاتا

کہہ کے بیمار سے یہ بجھ گئی شمع
رات ہوتی ہے یوں بسر دیکھو

اس اسلوب بیان سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے تخئیل پر شکوہ الفاظ و تراکیب کی حامل نہیں ہو سکتی ۔ لیکن اسکے خلاف عزیز نے اپنی سادگی میں وہ بناؤ پیدا کئے ہیں کہ جواب نہیں ہو سکتا ۔ درجۂ اول کی شاعری کا ایک یہ بھی معیار سمجھا جاتا ہے کہ شاعر الفاظ کے ذریعے "مصوری" میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے ۔ اس معیار پر عزیز صف اول میں بھی نمایاں معلوم ہوتے ہیں ۔ کچھ تصویریں بنائی ہیں ۔ لیکن کمال یہ ہے کہ ذہن کے سامنے مکمل تصویر پیش نہیں کی جاتی بلکہ محض بعض "خط" اور ذہن فوراً ان خطوط سے مکمل تصویریں پیدا کر لیتا ہے ۔ بالفاظ دیگر کہہ لیجئے کہ عزیز کے اصلی رنگ میں نسائیت (Feminine Grace) کے ساتھ ساتھ (Suggestibility) کا کافی حصہ ہے ۔ اچھا تو اب کچھ مرقع دیکھئے :-

شیشۂ دل کو یوں نہ اُٹھاؤ
دیکھو، ہاتھ سے چھوٹا ہوتا

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا

اک اُن کا دل ہے کہ دم بھر ہنسی نہیں رکتی
اک اپنا حال کہ ضبطِ فغاں نہیں ہوتا

نظروں نے دیکھی شرم کی اک قدرتی کشش ‌ ‌ ‌ انگڑائی لیکے جب کوئی محفل میں رہ گیا

ہنس رہا ہے دیکھ کر یہ کون تجھ کو دیر سے ‌ ‌ ‌ سر اُٹھا اے دل سے باتیں کرنے والے سر اُٹھا

ارے کھلے ہوئے پھولوں کے توڑنے والے ‌ ‌ ‌ چمن میں کوئی نہیں آشنائے دردِ بہار

یہ محاکات ہے اور حد درجہ نازک قسم کی۔ بعض صاحب کمال مصور پوری تصویر نہیں بناتے۔ صرف آنکھوں کا زاویہ یا پیشانی کی شکنیں یا ہاتھ کی اُنگلیاں بناکر چھوڑ دیتے ہیں۔ اور ان نقوش میں وہ صحت اور معنویت ہوتی ہے کہ دل و دماغ کسی اضافے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کرتے۔ عزیز نے یہ مصوری الفاظ میں کی ہے اور یہ ان کے کمال کا ایک باوقار پہلو ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ہر خاکے میں رنگ بھر کر مکمل کیا جائے اور ایک کے نیچے لکھا جائے "دیکھو ہاتھ سے چھوٹا ہوتا!" دوسرے کے نیچے "وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا" تیسرے کے نیچے "دم بھر ہنسی نہیں رکتی" چوتھے کے نیچے "شرم کی اک قدرتی کشش"، پانچویں کے نیچے "سر اُٹھا دل سے باتیں کرنے والے سر اُٹھا" اور آخری خاکے کے نیچے "ارے کھلے ہوئے پھولوں کے توڑنے والے!"

لیکن یہ غلطی ہوگی اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ عزیز کا شاعرانہ کمال صرف اسلوب بیان کی لسانیت اور مصورانہ نزاکت پر ختم ہو جاتا ہے۔ عہد حاضر کے ناقدوں نے تخیل کو مخصوص اہمیت دے رکھی ہے۔ کسی شاعر کا کلام سامنے آئے پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ اس کی تخیلی قوتیں کس حد تک صحیح اور بلند ہیں۔ عزیز اس معیار پر بھی پورے اُتریں گے اور بڑی بات یہ ہے کہ اُنھوں نے کسی ایک جگہ بھی تخیل پرستی کے اُصول سے مرعوب ہو کر اصل غزل سے اجتناب یا تغافل نہیں برتا ہے۔ چنانچہ ان کے چوٹی کے کلام میں تخیل کی بلندی اور صحت کے ساتھ غزل کے تمام مستحسن عناصر مثلاً حسن و عشق، ذوق و شوق، جذب و اضطراب بدرجۂ کمال موجود ہیں اور ان خوبیوں میں نفسیاتی توازن نے اور چار چاند لگا دئے ہیں۔

اپنے مرکز کی طرف مایل پرواز تھا حسن ‌ ‌ ‌ بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

دیکھ کر نظم دو عالم مجھے کہنا ہی پڑا ‌ ‌ ‌ یہ سلیقہ ہے کسے انجمن آرائی کا

دل کو جونہی سکوت ہوا جسم سرد تھا ‌ ‌ ‌ وہ مدتِ حیات تھی جب تک کہ درد تھا

صرف اک خیال عشق تھا تکلیف دہ عزیز ‌ ‌ ‌ تھا دل میں درد اور نہ کلیجے میں درد تھا

جان دی تو پھر ان کو درد آشنا پایا ‌ ‌ ‌ روح ایک نالہ تھی آج اسے رسا پایا

شمعیں افسردہ جہاں، پھول ہیں پژمردہ جہاں ‌ ‌ ‌ دل کو اس گورِ غریباں میں پکارا ہوتا

چمن پر اپنی طرف دیکھ کر وہ ہنستے ہیں، ‌ ‌ ‌ اب ان کے واسطے کہئے کہاں سے آئے بہار

اُس کی شامِ غم پہ صدقے ہو مری صبحِ حیات ‌ ‌ ‌ جس کے ماتم میں تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

جو دی تھی حسن کو یہ دلفریبی — مجھے ہوش و ہواس اتنے دئے کیوں
میں بو الہوس کے ساتھ نہ رکھوں گا قدرِ عشق — گو یہ خلافِ رسمِ محبت ہی کیوں نہ ہو
غمِ دوست کے لئے کوئی ہنگامہ چاہئے — وہ ماتمِ جنازۂ حسرت ہی کیوں نہ ہو
ہے ضبطِ گریہ میرے لئے اک محال بات — گو آنسوؤں میں دل کی حقیقت ہی کیوں نہ ہو
زمانے کے حوادث خود مری فطرت میں داخل ہیں — مصیبت دل کی کیا کم ہے، بلائے ناگہاں کیوں ہو
اے حسنِ وقتِ مشقِ تصور تو دے ذرا — پھر وہ تجھے دکھاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

مندرجۂ بالا اشعار نہ صرف عہد جدید کی غزل گوئی کا بلند ترین معیار پیش کرتے ہیں بلکہ مستقبل کی غزلگوئی کے لئے سنگ بنیاد ہیں۔ یہاں ہر جذبہ نہ صرف سورج کی کرن کی طرح لطیف اور روشن ہو گیا ہے بلکہ منشور (Prism) میں نکھر کر قوس قزح کی رنگینیوں کا حامل ہو چلا ہے۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ عزیز کا یہی رنگ پختگی کے درجے کو پہونچتا گیا ہے اور ہمارے لئے ان کے تغزل کا یہی پہلو طرۂ امتیاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اچھے شعر کی ایک یہ بھی پہچان ہے کہ اسے پڑھتے ہی یا سنتے ہی دل و دماغ میں ایک چمک سی پیدا ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ شعر حافظے میں پیوست ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ ہزار بار کہیں گے کہ فلاں شعر اچھا ہے لیکن آپ اس پر الفاظ و تخئیل سے متعلق کوئی بحث گوارا نہیں کر سکتے۔ یہی حال عزیز کے مندرجہ بالا اشعار کا ہے۔ یہ اشعار بہت اچھے ہیں۔ آپ کہیں گے کیوں؟ میرا جواب ہے "محسوس کر کے دیکھئے"۔

فضل الدین اثر ایم۔ اے

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت

کتابی شکل میں

تاریخ اسلامی ہند جو نگار میں جزاً جزاً جنوری تا دسمبر ۳۸ء شایع ہو چکی ہے اُس کے کچھ فارم زاید چھپوا لئے گئے تھے چنانچہ اب وہ کتابی شکل میں طیار ہے وہ اصحاب جو نگار کے خریدار ہیں لیکن فایل کے علاوہ تاریخ علٰحدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، نیز وہ اصحاب جو نگار کے خریدار نہیں ہیں اسے حاصل کر سکتے ہیں۔ کتاب مع توقیت ۲۴۲ صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت مع محصول عہ/ ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

آیندہ جنگ میں کون کس کا ساتھ دیگا

جنگ ہونا لازم ہے اور وہ بھی مستقبل قریب میں اس سے انکار ممکن نہیں۔ جمعیت اقوام مردہ ہو چکی ہے، کیلاگ اور لوکارنو کے معاہدے پرزے پرزے ہو چکے ہیں، جمہوریت آہستہ آہستہ آمریت کے مقابلہ میں جھکتی جا رہی ہے، اسلحہ سازی اور جنگ کی طیاری دیوانگی کی حد تک جاری ہے اور ہر ملک انتہائی خود غرضی کے ساتھ دوسرے ملک کا گلا گھونٹنے کے لئے طیار ہے۔

لوگ غلطی سے یہ سمجھ رہے ہیں کہ گزشتہ جنگ میں اتحادیین کا جرمنی کے مقابلہ میں آنا صرف ایک ہمسایہ حکومت بلجیم کی آزادی قایم رکھنے کے لئے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ کا سبب محض تجارتی و بحری رقابت تھی اور مصر و مراکش میں جرمن درخور کسی طرح برطانیہ کو گوارا نہ تھا۔ بلجیم تو صرف بہانہ تھا ورنہ یوں بھی انگلستان فرانس کو جرمن کے مقابلہ میں مغلوب نہ دیکھ سکتا تھا اور اب بھی انگلستان کے یہ مصالح بدستور قایم ہیں، گو دوسرے حالات بہت کچھ بدل گئے ہیں۔

اس وقت جرمنی دیوانہ وار اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ اس کی آبادی جسمانی قوت میں ساری دنیا سے بڑھ جائے اور ساتھ ہی یہ کہ اس کی قوم ایک ممتاز جگہ حاصل کرے۔ اٹلی اپنی دھینگا مشتی سے اپنی کھوئی ہوئی قدیم عظمت کو واپس لینا چاہتا ہے، روس آہستہ آہستہ ایک اژدھے کی طرح آگے سرکتا جا رہا ہے، فرانس خاموشی کے ساتھ انتہائی حد تک اپنے کو مسلح کرتا جاتا ہے۔ انگلستان جو اپنی بحری قوت کے گھمنڈ میں غافل سو رہا تھا دفعتاً چونک پڑا ہے تو حیران ہے کہ کیا کرے کیا نہ کرے اور اس کا احساس اول اول اسوقت ہوا جب حبشہ کے جھگڑے میں انگلستان نے دیکھا کہ مسولینی لندن پر گولہ باری کرنے کی حد تک آمادہ ہو گیا ہے۔ اس احساس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی اپنے آپ کو مسلح کرنے لگا اور ۴۰۰ ملین پونڈ سالانہ مدافعانہ تدابیر پر صرف کرنے کی منظوری دیدی۔ الغرض اسوقت یوروپ کی حالت ایک ایسے میگزین کی سی ہے کہ ذراسی چنگاری سے دھماکا پیدا ہو سکتا ہے

روس، جرمنی اور اٹلی میں ایک نئی نسل پیدا ہوئی ہے جس نے گزشتہ جنگ کی ہولناکیوں کو بھلا دیا ہے اور وہاں کے آرٹ، لٹریچر اور سائنس میں عسکری رجحان پایا جاتا ہے۔

ہر چند جرمنی عہد نامۂ ورسائی کے پرزے پرزے کر چکا ہے، لیکن وہ اس پر قانع نہیں بلکہ گزشتہ جنگ میں جو ذلت اسے نصیب ہوئی ہے اس کا انتقام بھی لینا چاہتا ہے۔

انگلستان کی پالیسی گزشتہ جنگ کے بعد بہت کچھ مائل بہ امن ہوگئی تھی، بحری جہازوں کی تعمیر بھی کم کردی گئی تھی، فوجی بھرتی بھی ختم ہوچکی تھی، وہاں کی آبادی نے بھی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ کسی سے جنگ نہ کرے گی لیکن افسوس ہے کہ یہ سب کچھ خواب ثابت ہوا۔ جب تک جرمنی سیاسی، اقتصادی و عسکری حیثیت سے کمزور تھا اور اٹلی کی طرف سے کوئی خطرہ نہ تھا، انگریز مزہ میں تھا، چین سے ڈنر کھاتا تھا اور تمسکات کے بھاؤ کا مطالعہ کیا کرتا تھا، لیکن جب جرمنی نے اپنی فوجی قوت بڑھا کر وادی رہائن پر قبضہ کر لیا اور اٹلی جنگ حبشہ کے دوران میں بحر روم پر چھا گیا تو انگلستان کے کان کھڑے ہوئے اور اس نے بھی اپنی بحری و ہوائی قوت کو بڑھانے کی فکریں شروع کردیں اور ۱۵۰۰ ملین پونڈ کا صرف اس کے لئے تجویز کیا گیا۔

اب صورت حال یہ ہے کہ اگر جنگ چھڑ گئی جو بالکل یقینی ہے تو کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس سے متاثر نہ ہو۔ لیکن سب سے زیادہ قابل توجہ یورپ کے وہ ممالک ہیں جن کے درمیان روم اور برلن کے اشتراک عمل نے خط فاصل کھینچ دیا ہے، مغرب کے تمام وہ ممالک جہاں اجتماعی یا جمہوری اثرات زیادہ پائے جاتے ہیں، یقیناً ہٹلر اور مسولینی کی آمریت کا مقابلہ کریں گے اور اگر روس نے بھی ساتھ دیا جو ایک حد تک یقینی ہے تو ہٹلر اور مسولینی کی مخالف قوتوں کا پلہ بھاری ہو جائے گا۔

زیکوسلوویکیا پر جرمنی کے قبضہ نے فرانس کے سکون و اطمینان کو درہم برہم کر دیا ہے اور مفاہمت میونخ نے تو پوری طرح ثابت کر دیا کہ جرمنی کے مقابلہ میں آنے سے سب جھجکتے ہیں اور یہ جھجک زیادہ تر اس لئے ہے کہ اسوقت کوئی قوم جنگ کے لئے اس قدر طیار نہیں ہے جتنی جرمن قوم۔

اب آس پاس کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو لیجئے تو ان میں سب سے زیادہ اہمیت پولینڈ کو حاصل ہے لیکن اس کی سیاست خارجہ میں اس قدر جلد جلد انقلاب ہوئے ہیں کہ آیندہ کے متعلق کوئی صحیح رائے قایم نہیں کیجا سکتی کچھ دنوں پہلے تک فرانس کا اثر وہاں قوی تھا، لیکن بعد کو جرمنی نے اس سے معاہدہ کرکے اپنے اثرات وہاں پیدا کر لئے۔ ہر چند پولینڈ کی نجات اسی میں ہے کہ وہ فرانس اور انگلستان کا ساتھ دے، لیکن روس کی طرف سے اسکی بدظنی بہت بڑھی ہوئی ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ آخر میں جرمنی کا شریک ہو جائے۔

جوگوسلاویا میں بھی فرانس کے اثرات ختم ہو چکے ہیں اور اٹلی کے اثرات وہاں قایم ہو رہے ہیں اس لئے آیندہ جنگ میں وہ اٹلی کے خلاف تو لڑے گا نہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ بحر اڈریاٹک میں اٹلی کے دشمنوں کے جہازوں کو نہ آنے دے۔

رومانیا، فرانس کا دیرینہ دوست ہے، لیکن حال ہی میں وہاں فاسسٹ جماعت نے زور پکڑ لیا ہے اور غالباً گوگا کی قیادت میں وہاں کی حکومت فاسسٹی جماعت کے ہاتھ میں چلی جاتی مگر اس کی موت نے ہوا کا رخ پھر بدل دیا ہے، لیکن اب بھی ہر وقت اس کا امکان ہے کہ گوگا کا آئرن گارڈ جو بہت ذی اثر ہے رومانیا کو جرمنی کی آغوش میں ڈالدے۔ دوسری طرف انگریزوں کی طرف سے بھی رومانیا کو تجارتی مدد پہونچ رہی ہے اور اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ آیندہ جنگ میں وہ کس کا ساتھ دے گا، تاہم ہٹلر کی نگاہیں اسکی معدنیات پیٹرول پر لگی ہوئی ہیں اور زیکوسلاویکیا کے حشر نے اسے بہت متردد کر رکھا ہے اور شاہ کرول کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ وہ کس کی اعانت پر بھروسہ کرے۔

بلغاریا اُن ملکوں میں سے ہے جن کو گزشتہ جنگ عظیم میں سب سے زیادہ نقصان پہونچا تھا اور بلقان کی حکومتوں نے مستقلاً اسے غیر مسلح رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن شاہ بورس (جو شاہ اطالیہ کا داماد ہے) اٹلی کی مدد سے اپنے ملک کو پھر مسلح کر رہا ہے اور آیندہ جنگ میں وہ یقیناً اٹلی کا ساتھ دے گا اگر حالات نے اسے غیر جانبدار رہنے پر مجبور نہ کیا۔ حال ہی میں جرمنی سے بھی ایک تجارتی معاہدہ ہوا ہے جس نے جرمنی اثرات بھی وہاں پیدا کر دئے ہیں اور ان تمام حالات کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اگر اُسے جرمنی و اٹلی کا ساتھ دینے سے یہ توقع قایم ہو گئی کہ جنگ عظیم کے بعد جو علاقہ اس سے چھین کر رومانیا کو دیا گیا تھا، اسے پھر واپس ملجائے گا۔

ہنگری پر جرمن اثرات ظاہر ہیں کیونکہ اس کی اقتصادی فلاح جرمنی کے رحم و کرم پر موقوف ہے اور آیندہ جنگ میں اٹلی و جرمنی کا ساتھ دینا اس کے لئے ناگزیر ہے۔ اتاترک کے انتقال کے بعد ترکی کی آیندہ پالیسی کے متعلق کوئی صحیح رائے زنی کرنا مشکل تھا، کیونکہ اتاترک برطانیہ کی دوستی کو زیادہ عزیز رکھتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ مجبوراً روس کے ساتھ بھی۔ شام کے مسئلہ میں ترکی کو فرانس سے ضرور مخالفت تھی اور ہے، لیکن برطانیہ کی وجہ سے وہ بروئے کار نہ آسکتی تھی۔

ترکی کو اپنا طرفدار بنانے کے لئے اگر برطانیہ نے سولہ ملین پونڈ کا قرض اسے دیا تو جرمن نے بھی ساڑھے بارہ ملین پونڈ دئے، لیکن پلہ برطانیہ ہی کا بھاری رہا اور عصمت پاشا نے باوجود اس کے کہ وہ انگریزوں کو پسند نہیں کرتا مصلحتاً انگریزوں ہی کا ساتھ دیا جیسا کہ حال کے ترکی انگریزی معاہدہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

یونان کی پالیسی بہت مشتبہ ہے۔ ایک طرف وہاں انگریزوں کا بھی کافی اثر ہے اور دوسری طرف وہاں کا وزیر اعظم فاسسٹی اصول پر حکومت کو چلانا چاہتا ہے۔

اسپین پر چونکہ جنرل فرانکو قابض ہو گیا ہے اس لئے نازی اور فاسسٹی اثرات وہاں کھلم کھلا موجود ہیں اور آیندہ جنگ میں انھیں کا ساتھ دینا اس کے لئے ناگزیر ہے، پرتگال ہر چند اشتراکیت کا مخالف ہے۔

لیکن برطانیہ کے اثرات وہاں زیادہ ہیں اور دونوں میں فوجی اتحاد کا معاہدہ بھی ہو چکا ہے۔

اب ایشیا کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ عراق میں انگریزوں کی مخالفت بڑھتی جا رہی ہے اور ایرآن، برطانیہ کی اُن زیادتیوں کو کبھی نہیں بھول سکتا جو پٹرول کمپنی کے سلسلہ میں اس نے ایران پر روا رکھی ہیں، افغانستان کے تعلقات برطانیہ سے بہت زیادہ دوستانہ نہیں ہیں اس لئے غیر عربی مسلم حکومتیں کبھی برطانیہ اور روس کا ساتھ نہ دیں گی بلکہ غیر جانبدار رہیں گی۔ رہگئی عربوں کی حکومتیں سو ان میں سے اکثر فرانس و برطانیہ سے نفرت کرتی ہیں جس کا ثبوت فلسطین، عراق اور شام کی بےچینیوں سے ملتا ہے۔

جنوری سنہ ۳۷ء کا "نگار"

نظیر اکبر آبادی نمبر ہوگا

جن عنوانات پر مقالے درکار ہیں ان کی مختصر فہرست اس سے قبل کی اشاعت میں دیجا چکی ہے۔ وہ اہلِ قلم جو نظیر اکبرآبادی سے دلچسپی رکھتے ہیں انھیں اس میں حصہ لینے کی دعوت دیجاتی ہے۔

اسوقت تک حسب ذیل عنوانات تقسیم ہو چکے ہیں:-

نظیر و کبیر	= پروفیسر فراق گورکھپوری ام - اے
نظیر اور اردو شاعری میں واقعیت و جمہوریت کا آغاز	= پروفیسر مجنوں گورکھپوری ام - اے
نظیر تذکرہ نویسوں کی نظر میں	= مولوی امیر احمد صاحب علوی بی - اے
نظیر کا مذہبی مسلک	= ل - احمد اکبرآبادی
نظیر کی ہندوانہ نظمیں	= ڈاکٹر لکشمی دت صاحب
نظیر کے تلامذہ اور ہمعصر اساتذہ	= جناب مفتی انتظام علی صاحب اکبرآبادی
نظیر کے لسانی اختراعات و ادبی احسانات	= مولانا عبدالباری آسی
نظیر کا فلسفۂ زندگی و نظریۂ اخلاق	= جناب مخمور اکبرآبادی بی - اے
نظیر کی خصوصیات لسانی	= جناب مولانا سیماب اکبرآبادی

عنوانات مقرر نہیں ہیں ہر شخص اپنے لئے علحدہ عنوان تجویز کر سکتا ہے۔ اکتوبر تک مقالات کا پہونچ جانا ضروری ہے۔ نیاز

عدالت

گرم بازار فوجداری ہے

حکومتوں میں فوجداری، ریاستوں میں فوجداری، تعلیم گاہوں میں فوجداری، کارخانوں میں فوجداری، تیوہاروں میں فوجداری، مسجد و مندر میں فوجداری، اُردو ہندی میں فوجداری —— یہاں فوجداری، وہاں فوجداری۔۔ اور کہیں کہیں خدائی فوجداری!

لات مکے چل رہے ہیں، لاٹھیاں چل رہی ہیں، گولیاں چل رہی ہیں، تلواریں چل رہی ہیں، قلم چل رہا ہے، زبان چل رہی ہے، دماغ چل رہا ہے، جوتے چل رہے ہیں — کہیں کہیں سے پیٹ چلنے کی بھی خبر آجاتی ہے۔

ان سب سے نپٹنے کے لئے عدالتیں، لنگر خانے شفاخانے اور چندے کی فہرستیں کھلی ہوئی ہیں! غالب کے زمانہ میں فوجداری کے مقدمات عدالت ناز میں پیش ہوتے تھے۔ جیسا کہ آپ کو یاد ہوگا۔

پھر کھلا ہے درِ عدالت ناز   گرم بازار فوجداری ہے

لیکن جن فوجداریوں کا میں نے تذکرہ کیا ہے وہاں شاعری کا دخل نہیں ہے۔ تعزیرات ہند و ضابطہ دیوانی کی کارفرمائی ہے۔ عدالت ناز کے بجائے فوجداری اور دیوانی کی عدالتیں ہیں۔ فوجداری اور دیوانی ہی کی نہیں فوجی عدالتیں بھی — قومی عدالتیں، مذہبی عدالتیں، تجارتی عدالتیں، اخباری عدالتیں — جابجا اندھا دھند عدالتیں بھی ان میں کہیں فریقین مقدمہ ہیں، حاکم نہیں ہے۔ وکلا ہیں فریقین مقدمہ نہیں، حاکم ہیں قوانین نہیں —— ایسی بھی ہیں جہاں سزائیں ہیں اور کچھ نہیں! آج کی گفتگو میں عدالت کا مسئلہ زیر نظر ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ کس قسم کی عدالت پر گفتگو کی جائے آپ تو جانتے ہیں کہ جب کوئی معاملہ عدالت کے سامنے ہوتا ہے، اس وقت نفس معاملہ پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ سمجھدار لوگ بہت تامل کرتے ہیں اس لئے کہ اکثر کوئی نہ کوئی بات زبان سے ایسی نکل جاتی ہے۔ جس سے آدمی توہین عدالت کے جرم میں پکڑا جاتا ہے۔ پھر آج جب خود عدالت ہی پر براہ راست گفتگو ہونے والی ہے تو ظاہر ہے کہ ایک صاحب فہم ہونے کی حیثیت سے مجھ پر کتنی کتنی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہوں گی۔

لیکن ایک بات ضرور قابل اطمینان تو نہیں، قابل لحاظ ضرور ہے۔ اور وہ یہ کہ بعض ہستیاں ایسی بھی ہیں جنکا عدالت کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ لیکن وہ چاہیں تو سب کچھ بگاڑ دیں یعنی ظل اللہ۔ ان میں یقیناً نہیں ہوں۔ ممکن ہے آپ ہوں۔ بادشاہ پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ ہم آپ بادشاہ کے سایہ میں ہیں۔ اس لئے ہم آپ کا خدا ہی حافظ ہے! دوسری بات قابل لحاظ یہ ہے کہ عدالت کی زد میں عاقل و بالغ ہی آتے ہیں۔ اب آپ دیکھ لیجئے اگر یہ صفات آپ میں نہیں ہیں تو آپ بھی عدالت سے پناہ میں ہیں اور بقیہ ہم سب آپ سے پناہ خواہ ہیں۔ پاگل اور نابالغ کو عدالت کے سپرد نہیں کرتے۔ اسے پاگل خانہ یا تعلیم گاہ میں بھیج دیتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ پاگل خانہ پہونچکر حواس میں آجانے کا بھی امکان ہے۔ تعلیم گاہوں میں امتحانات اور اسٹرایک کی زد میں رہے سہے حواس بھی زایل ہوجاتے ہیں۔

عدالت کے سلسلہ میں پاگلوں کے رتبہ سے تو آپ واقف ہو ہی گئے۔ اب میں ایک اور بزرگ کا آپ سے تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ یعنی سرکاری گواہ، یہ جتنے زیادہ قابل گردن زدنی ہوں گے اتنے ہی زیادہ عدالت سے مراعات خصوصی کے سزاوار، انہیں کے باب میں کہا گیا ہے۔

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

ریڈیو سرکاری چیز ہے اور میں ریڈیو کا آوردہ ہوں۔ آپ کسی سلسلہ میں نہیں آتے۔ زبان اور محاورہ کا بیچ نہ ہوتا تو میں یہ کہنے کے بجائے کہ آپ کسی سلسلہ میں نہیں آتے یہ کہتا کہ آپ کس شمار و قطار میں۔ بہرحال اگر آجکل عدالت گفتاری میں، شیطان کے کان بہرے، کوئی نوع دیگر ہو، تو آپ یقین مانئے میں فی الفور سرکاری گواہ بننے کی درخواست کردوں گا۔ شیطان کے کان بہرے کہنے کو تو میں کہہ گیا۔ لیکن اگر کوئی صاحب یہ خیال کرتے ہوں کہ میں نے شیطان کے ساتھ زیادتی کی۔ تو میں ان سے معافی مانگتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ عدالت میں میرا سابقہ شیطان یا اسکے کسی دوست سے ہو! عدالتوں میں فرشتوں کی یوں ہی کیا کمی ہوتی ہے کہ میں ان بزرگ کو دعوت عدالت آزمائی دوں!

"سرکاری گواہ" بننے کے جو حقوق مجھے حاصل تھے ان کا میں نے تذکرہ کر دیا ہے۔ لیکن یہ اندیشہ ضرور ہے کہ ریڈیو والوں کو سرکاری گواہ بننے کا زیادہ حق پہونچتا ہے۔ کیونکہ وہ مجھ سے آپ سے کہیں زیادہ سرکاری واقع ہوئے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اوروں کے مقابلہ میں ان کو سرکاری گواہ بننے کا حق شفع حاصل ہے۔ بہرحال موقع آنے پر دیکھا جائے گا۔ کیا معلوم اونٹ یا عدالت کس کل بیٹھے!

اس کے ساتھ ایک اور دشواری بھی مدنظر ہے کسی بھلے مانس کے ساتھ پکڑے جانے سے مطلب یہ کہ ماخوذ ہوئے (اور ہندوستانی میں ہر لفظ یا فقرے کے ساتھ توضیحی عبارتوں کا دم چھلا روا رکھا گیا ہے) تو عدالت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ مطلب یہ کہ جس دروازہ سے چاہے داخل ہوجائے اور جس کھڑکی یا روشندان

سے چاہئے نکل جائے اور بالفرض نکل بھی نہ پائے جوتا برخاست، کچہری قیام میں بھی کوئی مضایقہ نہیں۔ لیکن جب عدالت خود فریق مقدمہ ہو تو اس کے دروازے اکثر بند ہو جاتے ہیں۔ بند ہونے سے یہ مراد ہے کہ عدالت کے بند کمرہ میں آپ کا قانونی معائنہ کیا جائے گا! اس ضروری اعلان و اعتراف کے بعد مجھے نفس مضمون پر بے تکان گفتگو کرنے میں کوئی تامل نہیں۔

سب سے پہلے اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ قانون کا سارا کھیل طاقت، کا ہے، چاہے وہ طاقت حرب و ضرب کی ہو، چاہے اخلاق و مذہب کی۔ اصولاً ہر حکومت اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ بات منوانے کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کر دے گی۔ اگر ہر شخص کو اس امر کا احساس نہ ہو کہ اس کے ادنیٰ سے ادنیٰ جرم کی بازپرس میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور شدید سے شدید قوتیں برسرکار آ سکتی ہیں تو زندگی کا شیرازہ جلد سے جلد برہم ہو جائے۔

عدالتیں، کیوں اور کیونکر قایم ہوئیں۔ اس کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔ اور طول طویل بھی، جب سے دنیا میں لوگوں نے مل جل کر رہنا سہنا شروع کیا اسی وقت سے قانون کا بھی دور دورہ ہوا، جس نے مختلف زبانوں اور مختلف اقوام و ممالک میں مختلف صورتیں اختیار کیں اور اب نوبت یہاں تک پہونچ چکی ہے کہ قانون سے ہمارا، رواں رواں جکڑا ہوا ہے۔ ہم قانون سے باہر نہیں ہو سکتے۔ کوئی کام قانون کی مدد بغیر یا قانون سے سرتابی کر کے نہیں کر سکتے۔ قانون بھی دو ایک نہیں، ان گنت ہیں۔ ان میں سے بعضوں کو ہم جانتے ہیں بہتوں کو نہیں جانتے۔ کتنوں کا لحاظ کرتے ہیں، کتنوں سے روگردانی کرتے ہیں۔ کبھی پکڑے جاتے ہیں۔ پھر یہی نہیں۔ بہت سے قوانین ایسے ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف پڑتے ہیں۔ ہمارا قانون دوسروں کے قانون سے ٹکراتا ہے۔ اسی لئے اکثر ہمارا سر بھی دوسرے کے سر سے ٹکرا جاتا ہے۔ جس کی مرہم پٹی ہسپتال میں اور کبھی کبھی تجہیز و تکفین گورستان میں ہوتی ہے۔ ہماری تمام زندگی معلوم و نامعلوم معقول و نامعقول قوانین سے جکڑی ہوئی ہے جس سے صرف موت کا قانون آزادی دلاتا ہے وہ بھی کیا معلوم!

ہاں تو قوانین ان گنت ہیں۔ مذہب کا قانون اخلاق کا قانون، فطرت کا قانون، حکومت کا قانون، فطرت کا قانون معاشرت کا قانون، جماعت کا قانون، اداروں کا قانون، اسی طرح خاندان، دولت، افلاس کا قانون، نوجوانوں کا قانون بوڑھوں کا قانون، غرض زندگی کی مکڑی جتنے تانے بانے بنتی رہتی ہے ان سب کے قوانین علحدہ ہیں اور علحدہ علحدہ عدالتیں بھی۔ اس بھول بھلیاں سے جو شخص سب سے زیادہ کامیابی کے ساتھ باہر نکل آئے اسی کو ہم سب سے بڑا آدمی کہتے ہیں!

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اکثر ایک قانون کی پابندی اسی حد تک کی جاتی ہے جس حد تک وہ کسی دوسرے بہتر قانون سے نہ ٹکرائے۔ انسان کسی ایسے قانون کا پابند نہیں رہ سکتا۔ جو اس کی مختلف حالتوں یا ضرورتوں کا لحاظ نہ رکھتا ہو۔ انسان میں غصہ، لالچ، خوف، شہوت، گھمنڈ، خود غرضی کی صلاحیتیں موجود ہیں جو موقع موقع سے ضرور ابھرتی رہتی ہیں۔ انھیں کو ہموار رکھنے کے لئے قانون کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ اس لئے

قانون کو کسی نہ کسی حد تک لچکیلا ہونا چاہئے۔

میں یہاں قانون کی ماہیت نفس سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اچھا قانون وہی ہے جو انسانی مقتضیات کا لحاظ رکھتا ہو انھیں مقتضیات کی روشنی میں قانون کی تعبیر کی جانی چاہئے۔ اچھی دوا وہ ہے جو انسانی اعضا اور انسانی گوشت پوست سے میل کھا سکے اور اچھا طبیب وہ ہے جو مریض کی مخصوص طبیعت اور ترکیب جسمانی کے مناسب حال دوا تجویز کر سکے۔ میں ایسے علاج یا معالج کا قایل نہیں ہوں جس کے ہاں مرض اور مریض دونوں پر لیبل لگے ہوں اور وہ آنکھ بند کر کے دونوں کو یکجا کر دیتا ہو۔ ٹھیک اسی طرح کی نسبت قانون اور عدالت میں ہونی چاہئے۔ بذاتہ میں سمجھتا ہوں کہ کسی دو جرم مجرم کی نوعیت یکساں نہیں ہوتی۔ اس لئے قانون کو بھی اسی طور پر تولنا پرکھنا چاہئے کہ وہ تولے اور پرکھے۔ مجرم پر عاید کیا جا سکے۔ عدالتوں کا یہی کام ہے اور میرا خیال ہے کہ نظائر اسی طریقہ کار کے نتائج ہیں۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ ہماری عدالتوں میں جرم کی نوعیت پر اتنا غور نہیں کیا جاتا، جتنا کہ قانون کی بال کی کھال نکالی جاتی ہے۔ ہم قانون پر زیادہ طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ملزم کی مخصوص نفسیات یا واقعہ کی مخصوص نوعیت پر بہت کم توجہ کرتے ہیں۔

"تمدن" کی ترقی نے دنیا کے کاروبار اتنے بڑھا دئے ہیں اور اس طور پر اُلجھا دئے ہیں کہ ہم ان پر غور کرنے کے بجائے ان کو جلد سے جلد کسی نہ کسی طرح طے کر دینے کے زیادہ کوشاں رہنے لگے ہیں۔ عدالتوں میں مقدمات کے فیصل کرنے میں اتنی احتیاط نہیں برتی جاتی جتنا کام ختم کر دینے کی کوشش کی جاتی ہے ہمارے حاکم اور ہماری عدالتیں اکثر یہ فرض کر لیتی ہیں کہ قانون اس قسم کی مشین ہے جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دکھاتی ہے بہت سی ایسی چیزیں ہیں جہاں مشین کی کارفرمائی مفید ہوتی ہے۔ لیکن عدالت اور تعلیم گاہوں کو مشین پر داختہ یا مشین آشنا کرنا بڑی غلطی ہے۔ ایک مشین لاکھوں آدمیوں کو ہلاک کر سکتی ہے۔ لیکن لاکھوں مشین ایک آدمی کو سنوار یا سدھار نہیں سکتی۔ آدمی کو تو آدمی ہی چاہئے۔

آپ تو جانتے ہیں اسوقت ہماری گفتگو قانونی عدالتوں سے ہے ورنہ دنیا میں معلوم نہیں کتنی عدالتیں ہیں، یہی نہیں بلکہ بعض قوانین ایسے ہیں جن کے لئے کوئی عدالت نہیں۔ طبیعیات ہی کے قانون کو لے لیجئے۔ یہ قانون ہمارے آپ کے رونے دھونے، مارنے مرنے اور اس قسم کی ساری خرافاتوں سے آزاد ہے۔ سورج چمکے گا ستارے ٹمٹمائیں گے۔ گرمی سے چیزیں بڑھیں گی۔ سردی سے سکڑیں گی۔ روزی میسر ہوتی ہو بھوک لگے گی۔ ایسے اور قوانین ہیں جن کے ماتحت نفع نقصان رنج راحت کی دھندے چلتے رہیں گے۔ ان کی لیپ پوت ممکن ہے ان سے چھٹکارا نا ممکن ہے۔

"قانون کی تاریخ" بڑی دلچسپ ہے۔ غور تو کیجئے جب دنیا پہلے پہل آباد ہوئی ہوگی اسوقت کے قانون کیا

ہوں گے اور اب جبکہ دنیا کی آبادی کی کوئی حد نہیں، اس کے قوانین کیا ہیں۔ کچھ اور نہیں تو اسی پہ غور فرمایئے کہ پہلے آبادی بڑھانے کے اُصول بڑھتے جاتے تھے اور اب آبادی گھٹانے کے لئے کیسے کیسے اسلحات کام میں لائے جاتے ہیں یا اعتباری حالات وی۔ پی ہوتے رہتے ہیں پہلے انسان فطرت کا غلام تھا، اب فطرت کو اپنا غلام بنانے کی فکر میں ہے، پہلے پیٹ بھرنے کے لئے شکار کرتا تھا، اب اقتدار بڑھانے کے لئے جنگ کرتا ہے پہلے طاقت کا نام قانون تھا، اب قانون کا نام طاقت بتاتے ہیں۔

یہ سب کچھ ہے لیکن بات جہاں کی تہاں ہے طاقت کی کارفرمائی پہلے بھی تھی اب بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے جو کام پتھرے سے لیتے تھے اب وہی کام آداب تسلیمات سے لیتے ہیں۔ پہلے جس واقعہ کا اظہار "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" ایسے بھدے جملے یا محاورہ سے ہوتا تھا، وہی اب شاد کے شعر سے ہوتا ہے۔

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہو محرومی جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

لیکن جس طرح قانون اور عدالت کی زد میں محض مقدمات کا دوران بڑھتا رہتا ہے اور فیصلہ کی نوبت اسوقت آتی ہے، جب فریقین مقدمہ کا بجائے خود فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے، اسی طرح آج کی تقریر میں محض قانون عدالت کا دوران بڑھتا رہا اور خلاصہ فریاد کی نوبت نہیں آئی۔ اس لئے میں تمہید کو چھوڑ اصل مقدمہ کی طرف رجوع کرتا ہوں میرا عدالتوں سے تعلق رہا ہے "ہسپتال" میں بھی مدتوں رہا۔ اس لئے آپ کو تعجب نہ ہونا چاہئے یونیورسٹی میں کیوں ہوں۔ لیکن اس سے آپ یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکال سکتے کہ میرا عدالت سے متعلق ہونا ہسپتال جانے کا باعث ہوا، جو عدالت کی زد میں آجاتا ہے اسے ہسپتال اور یونیورسٹی دونوں سے بہتر مقام پر بھیجتے ہیں۔

میں نے پنچ مجسٹریٹوں کے وہ زمانے بھی دیکھے جب نہ مجسٹریٹ قانون جانتے تھے اور نہ عورتیں لپ اسٹک مختار وکیلوں کے پاس پشتینی بستے اور مانگے کی عینکیں ہوتی تھیں جب بائیسکلیں صرف کپتان قسم کے لوگوں کے پاس ہوتی تھیں اور وہ کہیں معائنہ کو آتے تھے تو تھانہ دار صاحب ان کی بائیسکل کے پاس اس طور پر کھڑے ہوتے تھے جیسے کوئی نیاز مند دہاتی کسی شریر اور منھ زور گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے جھکا سمٹا اس طور پر کھڑا ہوتا ہے کہ گھوڑا ذرا چمکا اور یہ باگ چھوڑ کر بھاگا۔

اسی زمانہ کے ایک سن رسیدہ پنچ مجسٹریٹ صاحب کا تذکرہ ہے جو ایک آنکھ دو ایک حواس اور دونوں پاؤں سے معذور رہتے تھے، معدہ کے مریض اور بنئے کے مقروض تھے۔ ڈاک بنگلہ میں اجلاس ہوتا۔ جہاں ایک تبہ دار پالکی پر لاد پھاند کر پہونچائے جاتے۔ پالکی ایسی تھی جس کی چار گھنٹے پہلے سے مرمت شروع ہوتی تو دو گھنٹے کے لئے کام دیجاتی مدعی مدعاعلیہ اور ان کے حوالی موالی کہار کا کام دیتے۔ مختار وکیل صاحبان جلو میں چلتے۔ مجسٹریٹ صاحب بھاری بھرکم آدمی تھے اور بگھیوں میں سماتے تھے۔ کسی قسم کا شعور باقی نہیں رہا تھا۔ اس لئے وزن

میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ بیٹھے تو پالکی کے بیچ ہی میں تھے لیکن جدھر مدعاعلیہ ہوتا اسی طرف تکیہ کے سہارے لیٹ جاتے۔ اس طور پر دور سے دیکھنے والے فوراً سمجھ جاتے کہ فریقین میں مدعی کون ہے اور مدعاعلیہ کون۔ کچھ حاکم کا وزن کچھ زمین کی کشش کچھ پالکی کی بوسیدہ سیٹ، نتیجہ یہ ہوتا کہ مجسٹریٹ صاحب کا کولھوں سے اوپر تک کا بہت کچھ حصہ ایک گٹھری کی صورت میں پالکی کی پٹی سے نیچے نظر آتا یہاں تک کہ آپ آسانی سے دیکھ سکتے تھے کہ پالکی کی سیٹ کو مستحکم بنانے کے لئے کن کن چیزوں سے مدد لی گئی تھی مثلاً انگوچھا، نواڑ، ادوائن کی رسی، برگد کے پتلے گدے دور سے پالکی ایسی نظر آتی تھی جیسے کسی قبہ دار مزار کا عکس پانی میں پڑ رہا ہے۔ پیچوان کا ایک سرا حاکم کے منھ میں ہوتا اور بقیہ متعلقان مقدمہ کے پاس۔ ڈاک بنگلہ دور تھا۔ حقہ پیتے خواب دیکھتے، وکلاء کی بحث سنتے چلے جاتے اور کچہری پہونچتے پہونچتے مقدمہ کا فیصلہ سنا دیتے۔ واپسی میں اس کی اپیل بھی سن لیتے اور حسب مصلحت کبھی فیصلہ بحال رکھتے اور کبھی مسترد کر دیتے۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے واقعے آپ کو سنانا شروع کر دوں تو ممکن ہے آپ کی دلچسپی بڑھ جائے مگر میرا خطرہ میں مبتلا ہو جانا یقینی ہے۔ امکان کو یقین پر ترجیح دینا بڑی "غیر عدالتی" بات ہے اس لئے میں اس سے پرہیز کرتا ہوں۔ آج کل کی عدالتوں کی مثال آج ہی کل کے ڈاکٹروں یا مزاروں سے دی جا سکتی ہے۔ جس طرح آپ کسی مزار پر جائیں تو قدم قدم پر مجاور اور دربان آپ سے کچھ نہ کچھ "چراغی" وصول کرتے جائیں گے اور وقتاً فوقتاً دعائیں اور گالیاں بھی دیتے جائیں گے یہاں تک کہ آپ کی جیب خالی اور حواس مختل ہو جائیں گے یا جس طرح ڈاکٹروں سے سابقہ ہو تو تمام اعضاء رئیسہ و رذیلہ کا امتحان یا ان میں سے بعضوں کی قطع برید یا قلع قمع کراتے کراتے آپ دیوالیہ ہو جائیں گے یا ازکار رفتہ اسی طرح عدالتوں میں بھی چپراسی، کلرک اور وکلاء کی دار و گیر سے فریقین مقدمہ، اللہ ہی بہتر جانتا ہے، کہاں سے کہاں پہونچ جاتے ہیں۔

مقدمات کی مثال بعض ایسے امراض سے دی جا سکتی ہے جن کا علاج بڑا قیمتی اور انجام ہمیشہ افسوسناک ہوتا ہے۔ وکلاء اور حکام دونوں واقعات سے اتنا سروکار نہیں رکھتے جتنا کہ دفعات سے بڑی سے بڑی اور آخری سے آخری عدالت تک صرف قانونی موشگافی ہوتی ہے اس طور پر فریقین مقدمہ کی دادرسی ہوتی ہو یا نہیں قانون کو تعبیر و تاویل کی چرخ دے دے کر تصوف یقیناً بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ اب فی نفسہ عدالت، عدالت کا کام واقعہ کی تول پرکھ نہیں بلکہ دفعات قانون کی تول پرکھ رہ گیا ہے۔ ہم فریقین مقدمہ کے ساتھ انصاف نہیں بلکہ دفعات قانون کے ساتھ تصوف آزمائی کرتے ہیں اور بالکل ایسا ہے جیسے مریض کی جان بچانے یا تکلیف دور کرنے کے بجائے طبیب، تحقیق مرض پر پوری کوشش صرف کر دے۔ جس طرح ریاضیات" ایسا نپا تلا علم بھی ترقی کی آخری منزلوں تک پہونچکر صرف تصوف بنکر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح عدالتوں کا کام دادرسی کے بجائے

قانون آزمائی رہ گیا ہے۔

چپراسی، محرر، وکیل، حاکم، فریقین مقدمہ، بیانات، جرح، بحث، سمن، وارنٹ، دوران مقدمہ، ان سب کی ترکیب استعمال تا ترتیب انجام مستقل عنوانات ہیں جن پر اس مختصر عرصہ میں اظہار خیال ناممکن ہے۔

آخر آخر میں آپ اتنا البتہ سمجھ لیجئے کہ سزا اور قانون کے دو بنیادی اُصول یہ ہیں۔ یعنی جو بات کہی جائے اُسے کوئی نہ مانے یا جو بات منع کی جائے اُسے کوئی کر گزرے۔ انھیں اُصول کے ماتحت شیطان راندہ درگاہ ہوا اور حضرت آدم جنت سے نکالے گئے۔ عدالت کا کام یہ ہے کہ وہ قانون کے اسی دو پہیہ کی گاڑی کو لڑھکاتی رہے اسی گاڑی پر دنیا کے سارے کھیل کھلونے لدے ہوئے ہیں اور گاڑی نامعلوم منزل کی طرف چلی جا رہی ہے۔ گاڑیبان کا فرض راستہ کے نیچے اونچے دیکھتے ہوئے گاڑی کو ہانکتے رہنا ہے۔ گاڑی کہاں جائے گی گاڑی کے پہیہ کیسے ہیں گاڑی کی ساخت کیا ہے، راستہ کی دشواریوں سے گاڑی کو کیونکر گزارا جائے گا۔ ان تمام باتوں کی ذمہ داری قانون بنانے والے اور منزل کے متعین کرنے پر ہے۔ گاڑیبان کو ان باتوں سے سروکار نہیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ گاڑی کے پہیے اور اس کے متعلقات کاٹ کباڑ کی ہوتی ہیں لیکن اس میں طاقت اسٹیم یا بجلی یا منہ زور جانور کی پہونچا دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں گاڑی پہلے ہی دھچکے میں پاش پاش ہو جائے گی۔ کبھی انجن کو اسٹیم یا بجلی کے بجائے بیل، گدھوں سے کھینچنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ بیل گدھے تھک کر تباہ ہو جاتے ہیں اور انجن جہاں کا تہاں رہ جاتا ہے۔ کبھی کبھی ہوائی جہاز اور اسٹیم انجن کے چلانے والے کو چھکڑا اور بہیلی ہانکنے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں کس کا کیا انجام ہوگا۔

رشید احمد صدیقی

مطلوب ہیں

نگار جنوری ۳۲ء۔ نومبر ۳۳ء۔ جنوری و اپریل تا ستمبر۔ نومبر دسمبر ۳۴ء۔ جون ۳۵ء۔ مئی و اگست ۳۶ء۔ فروری۔ دسمبر ۳۷ء کے نگار کے پرچے جو صاحب علحدہ کرنا چاہیں۔ دفتر کو اطلاع دیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

فلسفۂ مذہب

اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے۔ اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے تالیف کیا ہے۔

اصل قیمت عہ۔ رعایتی ۱۲/۔ علاوہ محصول

منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مکتوبات نیاز

مکرمی - یہ آپ سے کس نے کہدیا کہ "گفت وشنید" غلط ہے۔ اگر شنودن اور شنیدن دونوں صحیح ہیں تو شنید وشنود کو بھی درست ہونا چاہئے، بیدلؔ کہتا ہے:-

شنیدم کہ شیخ زماں بایزید شبے داشت باعشق گفت وشنید

اب غالباً آپ کو اطمینان ہوگیا ہوگا۔

آپ نے جس کامیابی پر مبارکباد دی ہے، اس کا شکریہ تو خیر مجھے ادا ہی کرنا ہے، لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ

تعمیر باندازۂ ویرانی ما نیست

یہ میں انسانی تمناؤں کی نامعقول وسعت کے لحاظ سے نہیں کہہ رہا بلکہ بالکل ریاضی کے اُصول کے ماتحت دو اور دو چار کی حیثیت سے عرض کر رہا ہوں۔ قسمت کا قایل نہیں کہ ہر تکلیف کو مصلحت خداوندی سمجھکر خاموش بیٹھ رہوں اور دماغی رجحان یہ کہ رات کو دن اور دن کو رات کہنا کسی طرح گوارا نہیں۔

لیکن، لاحول ولاقوۃ، میں یہ کیا قصہ لیکر بیٹھ گیا، آپ نے ازراہ محبت میری مسرت کو مسرت مان کر اس میں حصہ لیا اور میں فلسفۂ لذت والم لے بیٹھا۔ باور کیجئے، میں آپ کے جذبۂ خلوص کی قدر کرتا ہوں اور آپ کی محبتوں کا ازبس سپاسگزار ہوں۔

قبلہ میرصاحب - تسلیم - یقیناً یہاں کی شیعہ سُنّی نزاع حد درجہ تکلیف دہ ہے، لیکن میں اسے بھی ڈماکریسی کا کرشمہ سمجھتا ہوں۔

والٹیر کہتا ہے:-

"یوں اگر تم کوئی بات میرے خلاف کہو تو شاید میں خاموش رہوں گا، لیکن اگر تم نے یہ کہدیا کہ تمھیں ایسا کہنے کا حق حاصل ہے تو میں اپنی جان دیدوں گا"

اسوقت سوال نہ بوبکر و علی کا ہے، نہ خلافت و امامت کا بلکہ صرف اس بات کا کہ ایک فریق ایک بات کو اپنا حق کہکر تسلیم کرانا چاہتا ہے اور دوسرا اسے نہیں مانتا۔

میرے نزدیک یہ سب زندگی کی علامتیں ہیں۔ اگر تمام مسلمان من حیث القوم کچھ نہیں کر سکتے تو من حیث العقیدہ ہی کسی ایک کو تو اُبھرنے دیجئے۔ نہ اب مدح صحابہ کوئی وزن رکھتی ہے نہ تبرا، معنوی حیثیت سے دونوں لغو ہیں، لیکن اگر اس بہانہ سے ان میں کوئی احساس زندگی پیدا ہوتا ہے، تو کیا حرج ہے۔ دونوں کو لڑنے دیجئے، اگر کوئی ایک بھی سنبھل گیا تو محنت وصول ہوگئی، ورنہ تباہ ہونا تو اس قوم کی قسمت میں لکھا ہی ہے، آج نہ سہی کل، سیاسی گمراہی سے نہ سہی، مذہبی گمراہی سے، ایک ہی بات ہے۔

صدیقی - خط ملا - میرزا صاحب نے بڑھاپے میں شادی کر لی تو کیا برا کیا تمھیں معلوم نہیں کہ انسان دوسرے حیوانات سے صرف اس لئے ممتاز ہے کہ وہ بغیر پیاس کے پانی پی لیتا ہے اور ہر موسم میں محبت کر سکتا ہے پھر کیا مرزا جی کو تم نے انسان نہیں سمجھا۔

میرا ارادہ فی الحال کہیں باہر جانے کا نہیں ہے اور، ہو بھی تو پورا کب ہوتا ہے۔ عزم و ارادہ میں وہ پختگی اب کہاں!۔ دل کمزور، دماغ ضعیف، حوصلے پست، ولولے سرد۔ تفریح کی جگہ ضرورت نے لے لی اور لطف کی جگہ افادیت نے، بات بات میں چون و چرا ہے اور ہر ہر قدم پر عاقبت اندیشانہ پیش بینیاں! انگریزی کے دو فقرے سناتا ہوں ترجمہ ان کا نہیں ہو سکتا اس لئے اصل زبان میں سنو:-

What is matter — never mind.
What is mind — it matters not.

یہ صرف الفاظ کا کھیل نہیں ہے، بلکہ فلسفہ ہے اس دورِ حیات کا جو اٹھارہ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے اور ۳۰ سال کی عمر میں ختم۔ پھر تمھیں بتاؤ کہ مادہ و نفس دونوں کو بھلا دینے والا زمانہ اب کہاں مل سکتا ہے۔ اب تو یہی دو چیزیں سامنے ہیں اور انھیں کی باہمی جنگ نے بیکار کر دیا ہے۔ تمھیں بتاؤ کہ ان میں صلح و آشتی کی کوئی صورت ممکن ہے یا نہیں؟

عزیزی - کل شفیع کا خط آیا ہے، تمھاری طرف سے وہ بہت بددل ہیں، تفصیل تو کچھ لکھی نہیں، لیکن بعض فقروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید تم نے کوئی وعدہ اُن سے کیا تھا اور پورا نہ کیا۔ کیا یہ صحیح ہے؟ ہر چند میں جانتا ہوں کہ تم نے ارادتاً کوئی بات ایسی نہ کی ہوگی جس سے انھیں تکلیف پہونچے، لیکن سوال۔

یہ ہے کہ تم کسی سے وعدہ ہی کیوں کرو کہ بعد کو ملال کی صورتیں پیدا ہوں۔

بہرحال مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ تم نے ان سے کیا کہا تھا اور انھیں کیوں شکایت پیدا ہوئی۔ تمہارا براہ راست ان کو لکھنا مناسب نہیں، مجھے لکھو، پھر میں سمجھ کر اُن سے گفتگو کروں گا۔

یقیناً تم سے لڑنے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے، لیکن اعترافِ شکست کی بھی کوئی صورت نہیں۔ تمہارے "نہیں" کے جواب میں اگر "ہاں" نہیں کہہ سکتا تو خاموش رہنے سے مجھے کوئی چیز باز رکھ سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمھیں راستی پر ہو، لیکن میں کیوں نہ ہوں، یہ بھی تمہارے ہی سوچنے کی بات ہے۔

میں جانتا ہوں کہ جن حالات سے تم گزر رہے ہو، وہ انسان کو اس کے سایہ سے بھی گریزاں بنا دیتے ہیں، لیکن جب تک اس دنیا میں جینا ہے، تم کیا ایک بادشاہ بھی، اور بادشاہ کیا بلکہ ایک گدائے گوشہ نشیں بھی، علایقِ تمدن کی گرفت و احتیاج سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کر سکتا۔ جب تک سانس لینے کے لئے آکسیجن کی ضرورت ہے کاربن کے خطرات کا مقابلہ ضروری ہے۔

میں جانتا ہوں کہ تعلقات بڑھانا خوب نہیں، لیکن جو پیدا ہو چکے ہیں، ان کو دفعتاً قطع کر دینا بھی دانشمندی نہیں۔ تم ان سے ملنا ترک کر کے، انھیں تو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتے، لیکن اپنے مفاد کو ضرور خطرہ میں ڈال سکتے ہو۔ بیت الخلا کونسی تفریح کی جگہ ہے، لیکن مجبوراً جاتے ہو اور بیٹھتے ہو۔ پھر اس میں کیا حرج ہے۔

تم کو ابھی غصہ ہے؛ اس کو فرو ہو جانے دو، اس کے بعد کوئی فیصلہ کرنا

عتاب نامہ پہونچا

پارۂ شوخ و پارۂ نمکیں
ہائے دشنام ناتمام کے

جلی کٹی کا لطف اسوقت ہے جب شاہد و مشہود دونوں یکجا ہوں۔ آپ نے کوئی الزام قایم کیا، میں نے اسے رد کیا، آپ کو اس پر غصہ آیا، میں خاموش ہو گیا۔ میری خاموشی پر آپ کی برہمی اور بڑھی، میں ہنس پڑا۔

اب آپ ہی بتائیے کہ سرکار کی آشفتگی مزاج کا کیا عالم ہو گا جب پورے چھ دن کے بعد آپ کو یہ معلوم ہو گا کہ مجھ پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا اور میرے دل پر کیا گزرے گی جب میں یہ سوچوں گا کہ آپ مسلسل ہونٹ چبا رہی ہیں اور میں اس منظر سے دور ہوں!

ہاں، تو میں کیا ہوں؟ صاف صاف کہئے، چھپانے کی ضرورت نہیں ..... تمھیں ڈر کس کا ہے؟

لیکن یہ یاد رہے کہ باوصف ان تمام نقائص کے آپ کا "اداشناس" دنیا میں اگر کوئی ہے تو صرف میں! کیوں ہے نا یہی بات؟

اچھا تو فیصلہ یوں ہونا چاہئے کہ "سخن طرازی و دانش" کا دعویٰ میں ترک کرتا ہوں اور "نالۂ حزیں" قبول کرنے کا وعدہ آپ کیجئے۔ یعنی نہ میں یہ کہوں کہ صرف میں ہی آپ کا "گناہگار" ہوں اور نہ آپ سوائے میرے کسی اور کو "مستحقِ کرامت" ٹھیرائیں۔

وہ شخص جو انتظارِ ساغر" میں زندگی بسر کر رہا ہو، اس کے سامنے آپ خم کے خم لنڈھا دینے کی داستان بیان کریں! کس قدر ظلم ہے!

بیکس دلم، غریب دلم، بینوا دلم!

یہ تو خیر، جواب تھا صرف آپ کی شوخیوں کا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں خود حد درجہ نادم ہوں اور اگر آپ کا خط نہ آتا تو آپ کو مخاطب کرنے کی جرأت شاید اب بھی نہ کر سکتا۔

آپ کے شکوہ و شکایت نے جو اعتمادِ محبت میرے دل میں پیدا کر دیا ہے، اس کی بنا پر چند روز زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ بشرط آنکہ آپ اس کی اجازت دیں۔ بولئے کیا ارشاد ہوتا ہے۔

دامانِ چاک چاک و گریباں دریدہ را

کرمی۔ کئی سال ہوئے علی گڈھ کے ایک صاحب کوئی تذکرہ مرتب فرما رہے تھے اور انھوں نے مجھ سے بھی حالات دریافت کئے تھے۔ جو کچھ میں نے انھیں لکھا تھا وہی آپ کو لکھتا ہوں، یعنی:-

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست

خام بدم، پختہ شدم، سوختم

میں کیا اور میرے حالات کیا؟ آپ اس کو انکسار کہیں گے، لیکن حقیقت کے اظہار کی بھی تو کوئی صورت دنیا میں ہونا چاہئے۔ پھر آپ کیوں ایک شخص کو اس قدر مجبور کریں کہ جھوٹ بولنا اس کے لئے ناگزیر ہو جائے۔

افسوس ہے کہ میں تعمیل ارشاد نہ کر سکوں گا۔ اگر آپ کو ایسی ہی شدید ضرورت ہی تو "حالی پبلشنگ ہاؤس" دہلی سے وہ مرقع طلب کر لیجئے، جس میں انھوں نے مصنفینِ اردو کے حالات معہ اُن کی تصاویر کے شایع کئے ہیں۔ میرے پاس نہیں ہے ورنہ پیش کر دیتا۔

والسلام

اب آپ کیا پوچھتے ہیں کہ میں اس بزم سے کیا لیکر آیا۔ آہ،

وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم تھی

نگاہ کی قسمیں اتنی ہیں کہ شمار مشکل ہے:- سرشار۔ سرکش۔ تلخ۔ نوشیں۔ غلط انداز۔ عالم آشوب۔ عافیت سوز تغافل پسند۔ گرم خو۔ عربدہ پرور وغیرہ وغیرہ اور فارسی شعراء نے عجیب عجیب انداز سے اس کا ذکر کیا ہے۔

ظہوری کہتا ہے:-

دیوانۂ زنجیر نگاہِ تو نگشتست
دیوانہ کہ دارند بزنجیر نگاہش،

ملا جامی بیخود ایک جگہ لکھتا ہے:-

نگاہ محشرِ اُلفت کرشمہ ناز فروش

نگاہ کو "محشرِ الفت" کہنا کس قدر پیاری بات ہے۔

اسی کی دوسری تعبیر سنئے:-

مہیا کرد اسباب جنوں را شوخی جنبش
تبسم سازِ بیہوشی، نگہ مضراب بیتابی

ظہوری کا ایک شعر قیامت کا سنئے:-

مے نخوردست غالباً ہرگز آنکہ گفتست مے نگاہش را

لیکن غالبؔ کی یہ نگاہ، جو بظاہر نگاہ سے کم ہے، سب سے جدا ہے۔

اس میں بظاہر کی تخصیص نے جو خصوصیت پیدا کردی ہے اس کو دیکھ کر بار بار عرفیؔ کا یہ شعر یاد آتا ہے

ہجوم شوق تماشا و تیغ شرم ببیں۔
کہ دامنش ز نگاہ چکیدہ لبریز ست

"نگاہِ چکیدہ" صرف عرفیؔ کہہ سکتا تھا یا بیدل۔ بہرحال وہ کچھ بھی ہو، اس کا صحیح مفہوم وہیں جاکر معلوم ہوا۔ میں جانتا ہوں آپ نے یہ سوال کیوں کیا ہے؟ اچھا تو اب آپ اپنی رائے سے مطلع فرمائیے۔

مختار دلہن دلی کے مشہور ادیب مرزا صاحب کا ایک تازہ ادبی شاہکار جس میں آپ نے دلی کی سادہ۔ نکھری ہوئی اور دلکش زبان میں ایک تعلیم یافتہ اور مہذب گھرانہ کا قصہ بیان کیا ہے اور ہندوستانی عورتوں کی گھرستی زندگی کے بہت سے مسائل پر دلچسپ پیرایہ میں بحث کی ہے۔

کاغذ لکھائی۔ چھپائی عمدہ۔ ٹائٹل خوبصورت سہ رنگا۔ دس آنہ کے ٹکٹ بھیج کر ہم سے طلب کیجئے۔

منیجر حلقۂ اشاعت۔ زنبور خانہ۔ لکھنؤ

باب الاستفسار

حسن و محبت اور امرد پرستی

(جناب یاور حسین صاحب بخاری - رانی کھیت)

ایک اجنبی کا خط موصول کر کے آپ کو تعجب تو نہیں ہونا چاہئیے اس لئے کہ آپ ایسی ہستیوں کے نام ایسے خطوط غیر متوقع نہیں کہے جا سکتے۔ مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے اسی لئے تکلیف دے رہا ہوں اور اس امید کے ساتھ کہ آپ میری اس درخواست کو ٹھکرائیں گے نہیں بلکہ یقیناً مجھے مطمئن فرما دیں گے۔ میں تقریباً آپ کی تمام تحریریں دلچسپی کے ساتھ پڑھتا رہا ہوں اور پڑھتا رہتا ہوں۔ رسالہ نگار میں باب الاستفسار کے عنوان کے ماتحت آپ کی سلجھی ہوئی باتوں کو میں نے بہت ہی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ میں آپ سے توقع کرتا ہوں کہ اسی عنوان کے ماتحت آپ بے اس سوال پر بھی جو میں پیش کرنے والا ہوں ایک محققانہ روشنی ڈالیں گے۔

میرے ایک دوست جو حال ہی میں الہ آباد یونیورسٹی سے گریجویٹ ہو کر تشریف لائے ہیں اور انگریزی لٹریچر کا بہت کافی مطالعہ کر چکے ہیں آج تقریباً ایک ماہ سے مجھ سے "فلسفۂ محبت" پر بحث فرما رہے ہیں، نہ خود مطمئن ہیں اور نہ میں۔ ہم دونوں کی نگاہیں اسوقت آپ ہی پر پڑ رہی ہیں کیونکہ میں اس امر کا خوب اندازہ کر چکا ہوں کہ آپ کو بھی انگریزی لٹریچر سے بہت زیادہ مس رہا ہے۔ اس بحث نے میرے اور بھی بہت سے احباب کو اس میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا ہے اور ان سب کی طرف سے میں آپ کو آج یہ تکلیف دے رہا ہوں۔ مناسب ہوگا کہ میں ان کے تمام دلائل کو پیش کر دوں مخالفت کے پہلو کا بیان کیا ضرور ہے۔

سنئے فرماتے ہیں "انگریزی ادب کا مطالعہ کرنے سے خصوصاً شیکسپیر، کیٹس، شیلی وغیرہ کا کلام بنظرِ غائر دیکھنے سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ ان کا "مقصود محبت" یا میں یہ کہوں کہ "محبوب" جس کو مخاطب کیا گیا ہے ہمیشہ مرد رہا ہے اور جہاں "عورت" ہے بھی تو وہ نظم جو اس سے متعلق لکھی گئی ہے مقابلۃً پست ہے۔ مثال کے

طور پر شیکسپیر کی ہی دو نظمیں لے لیجئے (To his love) کے عنوان سے جو اس نے لکھا ہے اس میں بہت کامیاب ہوا ہے لیکن اسی کی دوسری نظم جس کا عنوان (Carpe Diem) نسبتاً بہت پست نظر آتی ہے۔ کیٹس کے متعلق اسی کے ایک نقاد کی رائے ہے کہ اس کی شاعری کا موضوع جب کبھی کوئی عورت بن گئی ہے تو گویا اس کے کمال پر ایک سایہ پڑ گیا ہے۔ سر فلپ سڈنی کی ایک مشہور نظم (A Ditty) ملاحظہ فرمائیے جو اس طرح شروع ہوتی ہے My true love hath my heart – & I have his. اس میں صاف طریق پر شاعر کا محبوب ایک مرد ہے۔

غرض اس قسم کی تذکیر سے جو میں نے سنا ہے فارسی شاعری میں بھی بہت کافی موجود ہے اور اردو میں بھی نظر آتی ہے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "معراج محبت" کے لئے محبوب کا مرد ہی ہونا ضروری ہے اور حقیقی محبت صرف ایک مرد اور دوسرے مرد کے ہی درمیان قایم ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں اپنے فلسفہ کے ماتحت میں جن دلایل سے کام لیتا ہوں وہ یہ ہیں کہ عورت سے جو محبت قایم ہوتی ہے وہ حقیقتاً محبت نہیں بلکہ نفس پرستی یا شہوانیت ہے۔ مرد، عورت سے صرف اپنی شہوانیت کو تسکین پہونچانے کے لئے محبت کرتا ہے جو جھوٹی اور بے بنیاد ہوتی ہے، جس میں شہوت کا عنصر ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ برخلاف اس کے مرد اس ظاہر کشش کا حامل نہیں ہوتا جو شہوانی جذبات کو مشتعل کر سکے اس لئے اس سے جو محبت ہوگی وہ یقیناً بے لوث اور دیرپا ہوگی۔ آسکر وائلڈ کا کلام دیکھنے سے اور خصوصاً اس کا ناول (The Picture of Dorian Gray) پڑھنے سے اس امر کا کافی ثبوت ملتا ہے۔

"حسن!" ہاں محبت کے لئے میں حسن کو ضروری سمجھتا ہوں، جب تک کوئی چیز حسین نہ ہو اور جذبات کو متحرک نہ کر سکے اس سے محبت نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس سلسلہ میں صرف حسن صورت پر ہی نظر رکھنا غلط ہے۔ چنانچہ عورت جذبات و ذہانت کے لحاظ سے بہت زیادہ پست ہوتی ہے۔ دوسرے حسن ظاہری کے اعتبار سے بھی " وہ حقیقی حسن کی مالک نہیں ہوتی" اس کا حسن صرف نفسانیت کو برانگیختہ کر سکتا ہے، برخلاف اس کے مردانہ حسن صرف "جذبات لطیف" کو ابھارتا ہے۔

سب سے بڑا ثبوت اس امر کا یونانی صنمیات کے پڑھنے سے ملتا ہے۔ یونانی اپنے وقت کے بہترین صناع اور آرٹسٹ تھے جس کی تاریخ شاہد ہے۔ ان کا بہترین آرٹ اور حسن مردانہ کے مجسمے اب تک پائے جاتے ہیں انھوں نے اس راز کو سمجھ لیا تھا کہ "حقیقی حسن" ایک مردانہ جسم میں ہی پوشیدہ ہے چنانچہ انھوں نے اس حسن کی قدر کرنا اور اس سے محبت کرنا شروع کر دیا — یہ دوسری بات ہے کہ حضرت لوط کے زمانہ میں یہی چیز بہت ہی ذلیل صورت میں نمودار ہوئی۔

کیا یہ واقعاً صحیح ہے کہ ایک آرٹسٹ کی نگاہ میں مرد کا حسن عورت کے حسن پر فوقیت

رکھتا ہے؟

(نگار) افسوس ہے کہ آپ نے حسن و محبت کا یہ افسانہ اس وقت چھیڑا جب میں
عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا

لیکن چونکہ انعکاسی لذت حاصل کرنے کی اہلیت ہنوز باقی ہے اس لئے اگر چند لمحے اس "تماشا" میں بھی صرف ہو جائیں تو کیا حرج ہے۔

حسن و محبت کے باب میں جب گفتگو کا موضوع یہ قرار پاتا ہے کہ حُسن کیا ہے اور محبت کیا، یا یہ کہ جذبات عشق کے اُبھارنے کی اہلیت کس میں ہے اور کس میں نہیں، تو بات جوانی کے حدود سے گزر کر عقل و ہوش کی اس دنیا کی ہو جاتی ہے جو جوانی کھونے کے بعد ہی میسر آتی ہے۔ اس لئے آپ لوگوں کے متعلق کم از کم یہ تو معلوم ہی ہو گیا کہ محبت کا جذبہ تو فی الحال آپ میں سے کسی میں نہیں پایا جاتا، علی الخصوص آپ کے دوست جو یونیورسٹی کی زندگی بسر کر کے واپس آئے ہیں کہ ان میں تو خیر ہونا ہی نہیں چاہئے، اور اگر کوئی کیفیت ان میں باقی ہے تو یقیناً اس کا تعلق "محبتِ افلاطونی" (Platonic love) ہی سے ہوگا۔

"حُسن و محبت" کی بحث میں لوگ غلطی سے پہلے حُسن کا مفہوم متعین کرنا چاہتے ہیں، درانحالیکہ سب سے پہلے ہمیں محبت کا تجزیہ کرنا چاہئے کہ وہ کیا چیز ہے۔ آپ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ محبت کے لئے حُسن کا ہونا ضروری ہے اور حُسن میں آپ ظاہری و معنوی جمال دونوں کو شامل کرتے ہیں، یہ درست ہے، لیکن اگر میں آپ سے پوچھوں کہ حُسن سے آپ کی کیا مراد ہے، تو شاید آپ خد و خال کا ذکر شروع کر دیں گے درانحالیکہ یہ کوئی معیار نہیں۔ وہی ایک چیز ہے جو مجھے بُری معلوم ہوتی ہے لیکن آپ اسے پسند کرتے ہیں، آپ کے لئے ناپسندیدہ ہے اور میرے لئے مرغوب۔ آپ بڑی بڑی آنکھوں پر جان دیتے ہیں درانحالیکہ ایک حبشی اپنی معشوقہ کی آنکھ کی تعریف یوں کرتا ہے کہ:۔ "عینہا کالسمسم والسمسم اکبر منہ" (اس کی آنکھ تل کی طرح ہے اور تل اس سے کچھ بڑا ہے) یورپ کا باشندہ گورے رنگ کی عورت پر جان دیتا ہے لیکن حبشہ والے مبروص سمجھ کر اس سے بھاگتے ہیں۔ اسے جانے دیجئے، آپ ایک ہی ملک، ایک ہی جماعت، ایک ہی قوم کے مختلف افراد کے ذوق کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ حسن کے باب میں کوئی متفق علیہ نظریہ ایسا قائم نہیں کیا جا سکتا کہ ہم اس کو معیار قرار دیکر ہر شخص کے حسین یا غیر حسین ہونے پر حکم لگا سکیں۔ اس لئے ہم کو حُسن کا مفہوم اس شے سے ہٹ کر ڈھونڈھنا پڑے گا جسے حسین کہا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس باب میں محبت سے زیادہ رہبری کرنے والی کوئی چیز نہیں۔

جیسا آپ نے فرمایا یہ بالکل صحیح ہے کہ جب تک کوئی شے حسین نہ معلوم ہوگی ہم کو اس سے محبت نہ ہوگی اور

یہیں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہر وہ چیز میرے لئے حسین ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ حُسن کا خلاق خود ہمارا جذبۂ محبت ہے، اور محبت سے قطع نظر کرنے کے بعد اس کا وجود کہیں نہیں پایا جا سکتا۔

ہذا سب سے پہلے ہمیں محبت کا مفہوم جان لینا چاہئے کہ اس کے بعد حُسن کا مفہوم خود متعین ہو جائے گا۔ محبت کا مفہوم اگر زیادہ وسیع لیا جائے تو ہمارے پاس ایک لفظ اس سے بہتر موجود ہے۔ انجذاب ۔ یعنی کسی کی طرف کھنچنا اور اس صورت میں حُسن کو ہم جذب کہیں گے، یعنی کسی کو اپنی طرف کھینچنا۔ گویا حسن و محبت کو ٹھیٹھ ہندوستانی زبان میں "کھنچنا اور کھینچنا" کہیں گے اور اس "کھینچا تانی" کا نام دنیائے حسن و عشق ہے۔

اس جگہ یہ بحث بالکل فضول ہے کہ ایک چیز ہمارے لئے باعث کشش کیوں ہوتی ہے۔ ماہرین سائنس کا بیان ہے کہ ہر شخص کے جسم سے برقی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں اور جب دو شخصوں کی شعاعیں منفی و مثبت ہونے کے لحاظ سے ٹھیک پڑ جاتی ہیں، تو باہم گر محبت ہو جاتی ہے، لیکن میرے نزدیک یہ صرف ظن و قیاس ہے اور اگر اس میں کوئی اصلیت ہو بھی تو اس کا تعلق صرف شہوانی محبت سے ہو سکتا ہے، محبت کے مفہوم کلی پر اس کا انطباق نہیں ہو سکتا۔ بہرحال وہ برقی شعاعوں کا اثر ہو یا انیشٹین کے نظریۂ اضافت کا یا کسی اور کیمیاوی تغیر کا محبت و حسن کی تعبیر "جذب و انجذاب" سے بہتر کسی اور لفظ سے نہیں ہو سکتی اور اسی کو سامنے رکھ کر اس پر غور کرنا چاہئے۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ جذب و کشش صرف انسانوں ہی کی دنیا کی چیز نہیں ہے، بلکہ نباتات و حیوانات کی دنیا میں بھی اسی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ آپ کے یونیورسٹی والے دوست نے اگر اپنے جامعہ میں Botany اور Zoology کا مطالعہ کیا ہوگا تو وہ اس کی تصدیق کر سکیں گے، لیکن خیر اس قدر زیادہ وسیع نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں، خود انسانوں میں دیکھئے کہ اس جذب و انجذاب کی کیفیت کتنی مختلف ہیں۔ پہلے اس کی دو بڑی تقسیمیں کرنا پڑیں گی، ایک انسان کی محبت انسان سے اور دوسرے ایک انسان کی محبت غیر انسان سے۔ ہم ایک پھول کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور بے اختیارانہ ہمارا ہاتھ یا ہمارا شامہ اس کی طرف کھنچ جاتا ہے، ہم شام کو شفقی رنگینیاں دیکھتے ہیں اور ہماری نگاہ اس طرف کھنچ کر رہ جاتی ہے، ہم ایک جانور پالتے ہیں اور جب وہ ہمارے پاس آتا ہے تو بے اختیار اس پر ہاتھ پھیرنے لگتے ہیں۔ یہ بھی سب اسی کشش کے کرشمے ہیں لیکن اس کا تعلق ہمارے ذوق یا ہماری اس فطرت سے ہے جو ہمارے اندر نرمی و لطافت کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور جس کا سبب ہم کو کچھ نہیں معلوم۔

انسان کی محبت انسان سے - اس کی نوعیت بھی ایک نہیں ہوتی۔ ماں کی محبت بچے سے اور بچے کی محبت ماں باپ سے، بھائی کی بھائی سے، دوست کی دوست سے، یہ سب ایک دوسرے سے جداگانہ کیفیت رکھتی ہیں

اور ان میں سے کوئی ایسی نہیں جہاں جذبۂ شہوانی کام کر رہا ہو۔ اس لئے یہ کہنا کہ محبت جہاں کہیں ہے اس جذبہ سے خالی نہیں، نادرست ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ میں اس کا بھی قایل نہیں کہ مرد کی محبت امرد کے ساتھ اس جذبہ سے خالی ہوتی ہے۔

اگر شیکسپیر، کیٹس اور شیلی کے کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ امرد پرست تھے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے وہ تھے واقعی ایسے ہی اور قدرتاً ان کی ایسی نظموں میں زیادہ جوش ہونا چاہئے، جن کے مخاطب نوجوان لڑکے ہیں شعراء انگلستان میں علاوہ ان کے مارلو، سوفٹ، جان فلیچر، بائرن اور ٹنی سن کا بھی یہی ذوق تھا۔ ٹنی سن کے محبوب کا نام بھی شاید آپ کو معلوم ہو کہ آرتھر ہیلم تھا۔

آسکر وائلڈ کا ذکر آپ نے پاک محبت کرنے والوں کے سلسلہ میں خوب کیا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس سے زیادہ امرد پرست ادیب شاید ہی اس زمانہ میں کوئی پیدا ہوا ہو۔ آپ نے اس کی کتاب پکچر آف ڈورین گرے کا ذکر کرکے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اس کی محبت پاک و بے لوث تھی۔ وائلڈ پر اس سے زیادہ ظلم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس نے تو یہ نام ہی اس لئے رکھا تھا کہ اس کی بے لوثی کی طرف غلطی سے بھی کسی کا خیال نہ جائے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ڈورین ایک یونانی نسل کی قوم تھی جس میں یہ ذوق حد درجہ ترقی کر گیا تھا بلکہ محققین کی رائے تو یہ ہے کہ یونان میں سب سے پہلے اس قوم نے امرد پرستی کی بنیاد ڈالی ورنہ ہومر کے زمانہ میں یہ ذوق وہاں نہ پایا جاتا تھا۔

شعراء کے علاوہ یورپ کے بعض نقاشوں میں بھی یہ ذوق پایا جاتا تھا۔ فرانس کا مشہور نقاش لیونارڈو اسی ذوق کی بدولت کئی بار قید کیا گیا اور میکائیل انجیلو کے خطوط و منظومات تو یکسر اس قسم کے جذبات سے لبریز ہیں ایک اور مشہور نقاش سلینی تھا وہ بھی اس جرم میں مقید کیا گیا اور جیرزم تو اسی کی بدولت قتل کیا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ یونانی اپنے وقت کے بڑے صناع تھے، لیکن وہ جتنے بڑے صناع تھے اتنے ہی بڑے امرد پرست بھی تھے۔

شہر سڈوم (Sodom) اس باب میں جتنا بدنام تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ساڈومی (Sodomy) کے معنے ہی لواطت کے ہو گئے۔ میں اس قسم کے تاریخی واقعات کہاں تک بیان کروں، اور کس کس ملک کا ذکر کروں، تقریباً ہر جگہ یہ ذوق پایا جاتا تھا اور اب بھی بہت سے اللہ کے بندے ایسے ہیں جو اس پر جان دیتے ہیں، لیکن اس ذوق کو معصومیت، بے لوثی، یا پاکیزگی کے ثبوت میں پیش کرنا اس قدر عجیب و غریب بات ہے کہ کم از کم میری سمجھ میں تو آتی نہیں، ممکن ہے آپ کے یونیورسٹی والے دوست نے کوئی صورت طہارت کی اس میں پیدا کر لی ہو۔

نوجوان لڑکوں کی طرف رغبت سوائے جذبۂ شہوانی کے اور کوئی معنی رکھتی ہی نہیں اور اگر اخلاقیات کے

نقطۂ نظر سے یہ کوئی ایسی بات ہے جس کو آزادی سے نہیں کیا جا سکتا، تو محض اس دلیل کی بنا پر کہ شیکسپیر یا شیلی کا بھی یہی ذوق تھا اس کو جذبۂ مقدس ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

آپ نے جس فلسفیانہ بلند محبت کا ذکر کیا ہے وہ دو پختہ عمر کے ہمسن مردوں میں تو بیشک پائی جا سکتی ہے لیکن نوجوان لڑکوں کے ساتھ قطعاً اس کا امکان نہیں اور جب کوئی شاعر کسی مرد کے ساتھ اپنے جذبات محبت کا ذکر کرے گا تو وہ یقیناً ذوریں قسم کا مرد یا لڑکا ہوگا۔

آپ کا یہ کہنا کہ عورت حقیقی حسن کی مالک نہیں ہوتی، کوئی معنی نہیں رکھتا، اول تو حُسن ہی علحدہ کوئی چیز نہیں چہ جائیکہ حقیقی۔ مرد جب تک عورت کی طرف کھنچتا رہے گا وہ حسین رہے گی اور عورت جب تک مرد کی طرف کھنچتی رہے گی وہ حسین رہے گا۔

رہا یونانیوں کے آرٹ کا حسن مردانہ سے متعلق ہونا اس کا سبب وہی ذوق تھا جس کا ذکر اوپر کیا گیا اور اگر اس کی پوری داستان آپ کو دیکھنا ہے تو میری کتاب شہوانیات کا مطالعہ کیجئے، جس میں نہایت تفصیل کے ساتھ یہ سب کچھ بیان کیا گیا ہے۔

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو اس ذوق کے دلدادہ ہیں اس کی ایسی ہی تاویلیں کیا کرتے ہیں، لیکن میں اسکو حد درجہ کمزوری و فریب خیال کرتا ہوں۔ اگر آپ اسے واقعی مذموم نہیں سمجھتے تو پھر علی الاعلان اس کو اختیار کیجئے جس طرح آجکل جرمنی میں اس کی تبلیغ جاری ہے۔ اس سے کیا فایدہ کہ اس کی رکیک تاویلیں کی جائیں اور فلسفہ و تصوف کی آڑ لیکر یہ شکار کھیلا جائے۔ دنیا کی کوئی بُری چیز اس لئے اچھی نہیں ہوسکتی کہ اس کا ایک فلسفہ بیان کیا جاتا ہے جدید تعلیم یافتہ حضرات نے فلسفہ کو ایک کھیل بنا رکھا ہے اور جب گفتگو کرتے ہیں تو دوسروں کو مرعوب کرنے کے لئے ہمیشہ کوئی نہ کوئی فلسفہ ضرور پیش کر دیا کرتے ہیں، درانحالیکہ وہ محض فریب نفس ہوتا ہے۔

یقیناً محبت کا فلسفہ ہے لیکن بالکل نفسیاتی اور اسدرجہ آسان کہ اس کو سمجھنے کے لئے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں ہر چیز کا ایک سبب ہوا کرتا ہے اور ایک غایت، اسی طرح محبت کی بھی وجہ و غرض ہونا ضروری ہے۔ اب آپ محبت کی جتنی صورتیں ہیں ان پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ بعض فطری ہیں اور بعض اکتسابی۔ مثلاً ماں باپ بھائی بہن اور اولاد کی محبت کہ یہ تو بالکل فطری چیز ہے اور اس سے بحث کی ضرورت نہیں۔ رہی اکتسابی صورت سو اس کے یہ سبب ہوسکتے ہیں، مادی منفعت، عظمت و احترام، ہم آہنگی خیال اور جذبۂ شہوانی۔

امراء سے ہماری محبت مادی نفع کی بنا پر ہوتی ہے، پیروں فقیروں اُستادوں اور لیڈروں سے محبت کا سبب جذبۂ عظمت و احترام ہوتا ہے، اور دوستوں سے ہم آہنگی خیال۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ جذبۂ شہوانی ہے خواہ اس کا ہدف جنس لطیف ہو یا جنس کرخت۔ آپ اس کا مطالعہ دوسرے زاویہ سے بھی کیجئے، وہ یہ کہ

شیلی وغیرہ نے جو نظمیں ایسی لکھی ہیں ان میں جن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے وہ عورت کے ساتھ بھی پیدا ہو سکتے ہیں یا نہیں، یعنی اگر آپ مردانہ ضمایر کو بدل کر نسوانی ضمایر رکھدیں تو مفہوم وہی رہتا ہے یا نہیں۔ اگر رہتا ہے تو یقیناً آپ اسے جذبۂ شہوانی کا نتیجہ کہیں گے اور اگر بدل جاتا ہے، تو وہ نظم عاشقانہ نہیں ہے بلکہ جذبۂ عظمت و احترام یا ہم آہنگی ضمیر کی بنا پر لکھی گئی ہے اور اس کا اندازِ بیان بھی یقیناً بالکل مختلف ہو گا۔

آپ اگر غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ اس طرح کے تخاطب میں بعض اوقات شاعر کا لب و لہجہ نسائی ہو جاتا ہے اور یہ نتیجہ ہے ذو جنسیّن (Bi-Sexuality) ہونے کا جو بقول ہولاک ریلیس اکثر ذہین افراد میں پایا جاتا ہے اور جس نے جولیس قیصر کے متعلق عام طور پر یہ بات مشہور کر دی تھی کہ "وہ سب عورتوں کا شوہر اور سب مردوں کی جورو ہے"۔

بہرحال جو صاحب بھی اس ذوق کے حامی ہوں وہ اس میں فلسفۂ تقدس و پاکیزگی تو پیدا کریں نہیں، البتہ وہ اس کے جواز میں تاریخی حوالے ضرور پیش کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ارسطو اور سقراط کے اقوال سے بھی ان کو مدد مل سکتی ہے اور وہ دنیا کی بعض اُن بڑی بڑی ہستیوں کو پیش کر سکتے ہیں جنھوں نے فن کی حیثیت سے اسے اختیار کیا اور اخلاقی نقطۂ نظر سے اسے معیوب نہیں جانا۔

جرمنی، ہمیشہ سے فلسفہ کا مرکز رہا ہے اور اب بھی ہے، لیکن وہاں سے زیادہ اس کا رواج کسی اور جگہ کم ہوا ہے۔ وہاں کا ایک مشہور شاعر ہنری فان کلیسٹ تھا اس نے اپنے محبوب ارنسٹ فان فیول کو ایک خط لکھا کہ:-

> "تم نے میرے لئے یونانیوں کا دورِ قدیم پیدا کر دیا ہے، میری روح تمھارا احاطہ کئے ہوئے ہے، جب تم جھیل میں نہاتے تھے تو میں تمھارے، خوبصورت جسم کو تکا کرتا تھا۔ آؤ، میرے ساتھ انسپاخ چلو اور عشق و محبت کے لطف اُٹھاؤ --- میں کبھی شادی نہ کروں گا"

وہاں اگر ایک طرف الگزنڈر فان ہمبولٹ ایسا صاحبِ فضل و کمال اس ذوق میں مبتلا نظر آتا ہے تو دوسری طرف کرپ ایسا صناع بھی (جس کے کارخانۂ آہن نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی تھی) اس کا دلدادہ ہے۔ جرمن اہلِ قلم میں پلیٹن، مارٹنز، الفلینڈ کو کون نہیں جانتا، اور اس باب میں ان کی سند بھی پیش کی جا سکتی۔ علاوہ اس کے وہاں اب بھی یہ تحریک کھلم کھلا پائی جاتی ہے اور اس کے متعلق جتنی کتابیں جرمنی سے شایع ہوئی ہیں اتنی دنیا کے کسی ملک سے شایع نہیں ہوئیں۔

بہرحال مدعا یہ ہے کہ ہر فعل اسی فعل کی نوعیت سے دیکھنا چاہئے۔ اگر شیکسپیر یا شیلی وغیرہ امرد پرست تھے تو ان کو ایسا ہی ظاہر بھی کیجئے، آپ کیوں اُن کے اس ذوق کی وہ تاویل کریں جو شاید انھیں بھی پسند نہ آتی اگر آج وہ زندہ ہوتے۔

مطبوعات موصولہ

من کی دنیا مختصر سا مجموعہ ہے جناب رشید قریشی کے بائیس افسانوں کا جن میں سے بعض مختلف رسایل و جراید میں شایع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعہ کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کا تعلق صرف دل کی دنیا سے ہے اور دل کی دنیا چونکہ بہ لحاظ تخیل بہت آزاد واقع ہوئی ہے، اس لئے اس کے بعض فسانے بڑی حد تک "کھل کھیلنے" کی مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

نوجوان فسانہ نگار نے کوشش کی ہے کہ جو کچھ ان پر گزری ہے یا اپنے اوپر گزار دینا چاہتے ہیں وہی قلمبند کریں اس لئے فسانوں میں نہ تازگی و جدت کی کمی ہے اور نہ بیباکی و جرائت رندانہ انداز بیان میں ادبیت بھی ہے اور سلاست و روانی بھی۔ علاوہ اس کے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسوقت حیدرآباد میں جس طرح کی اردو بولی جاتی ہے اس کے نمونے بھی اس میں اکثر جگہ ملتے ہیں۔ اس کی قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد۔

تمثیلی مشاعرہ نتیجہ ہے ہمارے فاضل دوست جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی جدتِ فکر کا۔ یہ ایک ڈرامہ ہے جس میں سودا، درد، میر، جرائت، مصحفی، انشاء، آتش، نسیم، ناسخ، ذوق، مومن اور غالب کو ایک جگہ جمع کر کے بزم مشاعرہ قایم کی گئی ہے۔

ہرچند یہ تمام شعراء ہمعصر نہیں ہیں، لیکن چونکہ جناب کیفی نے ان سب کو عالم بالا سے طلب کر کے یہ محفل منعقد کی ہے اس لئے سوال تقدم و تاخر کا باقی نہیں رہا اور وہ اجتماع جسے قدرت بھی نہ کر سکی تھی، کیفی صاحب نے کر دکھایا

آداب مشاعرہ کی جتنی مادی وغیر مادی خصوصیات ہو سکتی ہیں، کیفی صاحب نے ان سب کو پیش نظر رکھا ہے، یہاں تک کہ دوران غزلخوانی میں بہ سلسلۂ مرحبا و آفریں جو انتقادی یا تحسینی فقرے سامعین و شعراء کے زبان سے نکل جاتے ہیں، وہ بھی درج کر دئے گئے ہیں۔

یہ ڈرامہ جناب پروفیسر محمد عبداللہ صاحب، کاظم کے اہتمام سے لایل پور کالج میں پیش کیا گیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ بہت کامیاب رہا۔ بہرحال فن تمثیل کے لحاظ سے اس کی نوعیت جو کچھ بھی رہی ہو، لیکن ادبی و انتقادی حیثیت سے یہ کتاب ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

اس نوع کی پہلی کوشش مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے کی تھی، لیکن وہ ایک مخصوص زمانہ کے چند شعراء تک محدود تھی، کیفی صاحب نے اس خیال کو زیادہ وسعت کے ساتھ پیش کیا، یہ ڈرامہ آرٹ پیپر پر نہایت صفائی طباعت کے ساتھ مجلد شایع ہوا ہے اور انجمن ارباب ذوق لایل پور سے ایک روپیہ میں مل سکتا ہے۔

رازونیاز جناب اشعر دہلوی کی چند غزلوں کا مجموعہ ہے۔ خود شاعر نے دیباچہ میں اپنے کلام کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے "مناسب الفاظ" لانے کی پوری کوشش کی ہے اور اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:۔

"مذکورۂ بالا خصوصیت کے علاوہ اگر اور کوئی معنوی خوبی میرے کلام میں نظر آئے تو اس کو میرے کمال فن پر محمول نہ کیجئے گا بلکہ کسی شباب سے بھرپور ہستی کی چشم سحر کار کی افسوں طرازی کا نتیجہ خیال کیجئے گا کہ میری یہ تمام رنگین بیانیاں اور نازک خیالیاں اسی کی رہین منت ہیں"

گویا یہ غزلیں جناب اشعر کی حیات عشقیہ کی داستانیں ہیں اور اس لئے یقیناً انھیں پُرکیف ہونا چاہیے، لیکن سوال یہ ہے کہ ایسے کلام کا عنصر غالب رنگینی و نازک خیالی ہونا چاہیے، جس کے وہ مدعی ہیں یا عجز و فتادگی جو ان میں بالکل نہیں پائی جاتی۔

سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اشعر صاحب نے جگر کا تتبع کیا ہے اور ان کے کلام میں ایک طرح کی سرمستی ضرور پائی جاتی ہے، کلام صاف ہے اور بعض جگہ مضمون آفرینی و ندرت بیان بھی پائی جاتی ہے، لیکن باوجود "مناسب الفاظ" کی تلاش کے وہ کہیں کہیں ناکام رہے ہیں مثلاً

دل ترے تیر کا منت کش احساں نکلا

منت کش کے بعد لفظ احساں بیکار ہے۔

یا

یہاں سوخرمن حرف و حکایت قلب سوزاں میں

حرف و حکایت کے لئے خرمن موزوں لفظ نہیں ہے بلکہ دفتر ہونا چاہیے۔

بہرحال اشعر صاحب کی غزلیں بُری نہیں ہیں اور جگر کا رنگ پسند کرنے والوں کے لئے ان میں کافی سامان دلکشی موجود ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ دائرۃ الادب محلہ رودگراں دہلی۔

انشاء سلمیٰ جناب صاحبزادہ ولی احمد خاں صاحب ام۔ اے نے زنانہ خط و کتابت سے متعلق یہ مجموعہ مرتب کیا ہے اور دفتر عصمت دہلی سے شایع ہوا ہے، خطوں کی زبان بہت صاف و سہل ہے اور تکلفات سے بری۔ آخر میں بعض مشکل الفاظ کے معنے بھی دیدیے ہیں اور ترتیب مدارج کے لحاظ سے القاب و آداب بھی۔ قیمت ۶ روپے۔

دیہاتی گیت

یہ کتاب بھی عصمت بک ڈپو دہلی نے شایع کی ہے، اس میں جناب اعظم کریوی نے بہت سے وہ گیت اکٹھا کر دئے ہیں جو گاؤں میں مختلف موسموں اور تقریبوں میں گائے جاتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ ان کا مفہوم بھی دیدیا گیا ہے جس سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ اس وقت تک کوئی مجموعہ اس موضوع پر ہماری زبان میں شایع نہ ہوا تھا حالانکہ (Folk Song) کتابیں ادب کے لئے ضروری ہیں۔

مفتاح العربیہ

قاضی زین العابدین صاحب، سجاد میرٹھی نے عربی زبان سکھانے کے لئے یہ سلسلۂ تالیف شروع کیا ہے جس کے پہلے دو حصے ریویو کے لئے ہمیں موصول ہوئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ملک میں متعدد کتابیں شایع ہوئی ہیں جن میں سے بعض مفید ہیں اور بعض غیر مفید۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ سجاد صاحب نے جس انداز سے یہ سلسلہ شروع کیا ہے وہ یقیناً مفید و کار آمد ہے۔ پہلے حصہ میں انھوں نے معرفہ و نکرہ ترکیب اضافی و توصیفی اور افعال و اسمار کی مختلف اشتقاقی و ترکیبی صورتوں سے بحث کر کے مشق کرائی ہے اور دوسرے حصہ میں مختصر حکایات، مراسلات اور صحافت جدیدہ تک پہونچ گئے ہیں۔

ہر حصہ کے اخیر میں ایک فرہنگ بہت سے قدیم و جدید الفاظ کا دیدی گئی ہے جو ایک مستقل افادہ کی چیز ہے جو حضرات عربی زبان جلد سیکھنے کے شایق ہیں ان کے لئے اس سلسلہ کا مطالعہ ازبس مفید ہے۔ ہر حصہ کی قیمت ۱۰/ ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ علمیہ، میرٹھ۔

کلیات بحری

بارھویں صدی، ہجری کے آغاز میں ایک دکنی شاعر بحری پائے جاتے تھے یہ زمانہ اورنگ زیب کی حکومت کا تھا۔ ڈاکٹر محمد حفیظ سید کو شولاپور میں ایک نسخہ ان کے کلیات کا ملگیا اور انھوں نے اس کو جدید اصول پر مرتب کر کے نولکشور پریس لکھنؤ سے شایع کرایا ہے۔

بحری، ولی سے پہلے گزرے ہیں اور ان کی زبان فارسی، ہندی اور دکنی ملی جلی ہے۔

ڈاکٹر حفیظ صاحب کا یہ ریسرچ ادب اُردو کی تاریخ میں ایک قیمتی اضافہ ہے اور ارباب ذوق کو اسکی قدر کرنا چاہئے۔ کتاب مجلد، دبیز کاغذ پر شایع کی گئی ہے اور ۳۱۲ صفحات پر محیط ہے۔ قیمت تین روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ نولکشور پریس لکھنؤ۔

ہندوستانی

جناب دین محمد صاحب نے انگریزی زبان میں یہ پمفلٹ شایع کیا ہے اور لسانی و تاریخی حیثیت سے ہندوستانی زبان پر بحث کی ہے۔

اس وقت ملک کی عام زبان کا مسئلہ بہت اہم مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور اُردو ہندی نزاع نے اس میں چند در چند پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں۔ ملک میں ایک نئی زبان ہندوستانی کے نام سے پیدا کی جارہی ہے، لیکن وہ کیا ہے یا اسے کیا ہونا چاہئے ہنوز معرض بحث میں ہے۔ ہندؤں کا رجحان یہ ہے کہ اس میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ

ہونا چاہئے اور مسلمان کہتے ہیں کہ جب اس سے عربی و فارسی الفاظ خارج کئے جارہے ہیں تو پھر سنسکرت الفاظ کا شمول اس میں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جناب دین محمد صاحب نے اس مسئلہ کے ہر پہلو کو لیکر نہایت فاضلانہ گفتگو کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ہندوستانی زبان ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے جو آپس کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے اور اس کی آیندہ ترقی بھی اسی باہمی مسالمت و رواداری پر منحصر ہے۔ یہ پمفلٹ مطالعہ کے قابل ہے اور ۱۲ر میں مصنف سے ہال بازار امرتسر کے پتہ پر مل سکتا ہے۔

رپورٹ ہندوستانی اکاڈیمی

ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد نے اس انگریزی رپورٹ میں قیام اکاڈیمی کے آغاز سے اسوقت تک کی کیفیت پیش کی ہے۔ یہ اکاڈیمی ۲۶ء میں حافظ ہدایت حسین مرحوم کی تحریک و کوشش سے قایم ہوئی تھی اور مقصد یہ تھا کہ ہندی اُردو لٹریچر کی ترقی کے لئے کوشش کی جائے اور حکومت اس کی مالی مدد کرے۔

اکاڈیمی کی گزشتہ تاریخ اور اس کے کارناموں پر بحث کرنے کے لئے ایک مستقل مضمون درکار ہے لیکن بہ سلسلۂ ریویو ہم اسقدر ضرور عرض کریں گے کہ اسوقت جبکہ حکومت اس کی تنظیم کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے، اسکو زیادہ کارآمد و مفید بنانے کی ضرورت ہے، خصوصیت کے ساتھ ایسی حالت میں کہ زبان کا مسئلہ مابہ النزاع بنا ہوا ہے۔

سیاسیات کی پہلی کتاب

پروفیسر محمد عاقل ام۔اے نے مبادی سیاسیات پر یہ رسالہ لکھ کر بڑی اہم خدمت انجام دی ہے۔ اب وقت ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کو سمجھنا چاہئے کہ حکومت کس چیز کا نام ہے، اس کی کیا صورتیں دُنیا میں پائی جا سکتی ہیں اور ہمارے لئے وہ کس صورت میں مفید ہو سکتی ہے۔

اس رسالہ کی زبان، اس کا انداز بیان نہایت سلیس و شگفتہ ہے اور مغز و معنی کے لحاظ سے کچھ کہنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ عاقل صاحب اسی چیز کی تلاش میں اب پوست ہی پوست رہ گئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس کو ثانوی مدارس کے نصاب میں داخل کیا جائے تاکہ ہمارے نوجوانوں کو ابتدا ہی میں سیاسیات سے لگاؤ پیدا ہو جائے۔ یہ رسالہ مکتبۂ جامعہ دہلی سے ۴ر میں ملسکتا ہے۔

اجتماعی زندگی کی ابتدا

یہ رسالہ بھی پروفیسر محمد عاقل صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ انسان دُنیا میں کیونکر آیا اور رفتہ رفتہ اس نے کس طرح ترقی کی۔ اس میں عہد حجری سے لیکر عہد ایجادات تک کا ذکر کر کے یہ بتایا ہے کہ اس کی انفرادی زندگی نے کس طرح رفتہ رفتہ اجتماعی حیثیت اختیار کی اور اس کی کن کن صورتوں کا تجربہ اس نے کیا۔ یہ کتاب مکتبۂ جامعہ سے ۸ر میں ملسکتی ہے۔

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ اس رسالہ کو بھی مکتبۂ جامعہ نے شایع کیا ہے۔ اس کی اہمیت سے ظاہر ہے۔ ڈاکٹر زین العابدین صاحب نے اُس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر نہایت جامعیت سے نگاہ ڈالی ہے۔ قیمت ۴ر

میری کہانی جناب سید علی صاحب شاکر ام۔ اے کا لکھا ہوا، نیم مزاحیہ افسانہ ہے جسے حمایت دکن پرس حیدر آباد نے شایع کیا ہے۔ شاکر صاحب کے مزاح میں ایک خاص جان پائی جاتی ہے جس میں بہت کچھ امکانات ترقی پوشیدہ ہیں۔ غالباً شاکر صاحب کی یہ پہلی کوشش ہے۔ لیکن اپنے اندر وہ تمام علامتیں رکھتی ہے جو مشق و تجربہ کے بعد معیاری چیزیں ہو جاتی ہیں۔ زبان ٹکسالی ہے اور خیال میں جدت، لیکن تکلف سے خالی نہیں۔ امید ہے کہ رفتہ رفتہ بے ساختہ پن بھی پیدا ہو جائے گا اور شاکر صاحب ملک کے مشہور مزاحیہ نگاروں میں شمار کئے جائیں گے۔ اس کی قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ حمایت دکن پرس۔

محبت کا فسانہ ملک کے مشہور ادیب ل۔ احمد اکبر آبادی کا لکھا ہوا فسانہ ہے اور تمام اُن خصوصیات کا حامل ہے جو ان کی انشار کی مقبولیت کا باعث ہیں، اس میں انھوں نے فلسفۂ ازدواج کو پیش نظر رکھ کر بیوی اور شوہر کی نفسیاتی تحلیل کی ہے اور ایسے لطیف انداز سے کہ کتاب نے بیک وقت فلسفہ و انشاء بدیع دونوں کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ مکالمہ میں اگر انگریزی انداز اختیار نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ یہ ہے:۔ عظیم اطہر، محلہ من ٹولہ۔ آگرہ۔

من کی بتیا لطیف النسا بیگم بی۔ اے کے چند مقالات کا مجموعہ ہے جس میں متوسط طبقہ کی خواتین کو مخاطب کرکے ان کی معاشرتی و اخلاقی کمزوریوں کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت ۸ر ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن۔

مرقاۃ القرآن عربی سکھانے کی پہلی کتاب ہے جس میں ۴۰ اسباق قرآن مجید کی آیات سے اخذ و اقتباس کرکے دئے گئے ہیں۔ اس کے مولف مولوی محمد عبداللہ صاحب کامل پروفیسر گورنمنٹ کالج لایل پور ہیں۔ یہ رسالہ ۶ر میں انجمن ارباب ذوق لایل پور سے مل سکتا ہے۔

رباعیات عرش فاروقی مجموعہ ہے جناب عرش بریلوی کی ستر رباعیوں کا جن میں ہر رباعی کی ردیف "جوانی میری" ہے۔ چونکہ عرش نے عین عالم شباب میں انتقال کیا تھا اس لئے ان کی یہ جوانی والی رباعیاں حقیقتاً ان کے شباب کا مرثیہ ہیں جو ایک خاص کیفیت اپنے اندر رکھتی ہیں۔

سید الطاف علی صاحب بریلوی نے سلطان جہاں منزل علی گڈھ سے انھیں شایع کیا ہے اور چار آنہ قیمت مقرر کی ہے

مسلمان کیا کریں

مدینہ میں ایک سلسلۂ مضامین اس عنوان سے شروع ہوا تھا جس پر مختلف حضرات نے اظہار خیال کیا تھا۔ یہ انھیں میں سے چودہ حضرات کے مقالوں کا مجموعہ ہے جسے حلقۂ ادب لکھنؤ نے شایع کیا ہے۔

اسوقت ہندوستان کے مسلمان جس دور سے گزر رہے ہیں وہ سیاسی نقطۂ نظر سے نہایت اہم ہے اور ہمارے یہاں صحیح الفکر و مخلص لیڈروں کے فقدان نے اسے اور زیادہ اہم بنا دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ انفرادی حیثیت سے ہر شخص اس مسئلہ پر غور کرے، اور کسی نتیجہ تک پہونچے۔ یہ مجموعہ ایسے متجسس لوگوں کے لئے بہت مفید و کارآمد ہے۔

مدراس میں اُردو

اس کے مصنف جناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے ثابت کیا ہے کہ صوبہ مدراس میں اُردو زبان صدیوں سے مروج ہے اور وہاں بڑے بڑے شاعر و انشاپرداز پیدا ہو چکے ہیں۔

اس وقت جبکہ زبان کا مسئلہ تمام اہل ملک کے سامنے پیش ہے اس کتاب کی اشاعت بہت مفید ثابت ہوگی اس میں سیکڑوں ایسے مدراسی شعراء کا تذکرہ پایا جاتا ہے جن کو اس وقت تک کوئی جانتا بھی نہ تھا، اس لئے یہ کتاب فنی حیثیت سے بھی اُردو زبان کے لئے بڑا مقتدر اضافہ ہے۔ قیمت عہ ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

دفتر دیوانی سرکار عالی

حیدرآباد میں ایک خاص دفتر ہے جس کو دفتر دیوانی کہتے ہیں۔ اس کا تعلق اس قسم کی دیوانی سے نہیں ہے جو برطانوی ہند میں قرض و سود کی ڈگریاں دیا کرتی ہے۔ بلکہ اس میں تمام وہ فرامین، توقیعات، پروانے، اور اسناد وغیرہ محفوظ ہیں جو کسی وقت عہد مغلیہ میں شاہان مغل یا سلاطین آصفجاہی کی طرف سے جاری ہوئے تھے۔

مولوی خورشید علی صاحب موجودہ ناظم دفتر دیوانی نے اپنی غیر معمولی کاوش و جستجو اور اس سے بھی زیادہ اپنی خوش سلیقگی و حسن ذوق سے کام لیکر اس دفتر کو ایک ایسے "نوادر گاہ" کی حیثیت دیدی ہے جس کی اہمیت کا اندازہ دیکھنے ہی کے بعد ہو سکتا ہے۔ اس دفتر میں تاریخ عہد مغلیہ کے متعلق ایسے ایسے نادر کاغذات محفوظ ہیں جن کا علم ہی اس وقت تک کسی کو نہیں ہوا اور جن سے تاریخ ہند لکھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

زیر نظر مجلد میں انھیں میں سے بعض فرامین و اسناد کی ہاف ٹون تصاویر پیش کی گئی ہیں جو آرٹ پیپر پر نہایت نفاست سے طبع کی گئی ہیں۔ اس مجلد کے پیش کرنے سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ دفتر دیوانی کتنی اہم خدمت انجام دے رہا ہے اور جس وقت چھان بین کے بعد تمام قدیم اسناد و فرامین سلسلہ وار مرتب ہو جائیں گے تو تاریخ کا ذوق رکھنے والوں کے سامنے کتنا بڑا نادر ذخیرہ مواد تاریخی کا آجائے گا۔

مصنفین اُردو

حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے اس نام سے اُردو کے تمام اگلے پچھلے شعراء و مصنفین کے

مختصر حالات معہ ان کی تصاویر کے شایع کئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کی تالیفات کی بھی فہرست دی ہے۔ عہد حاضر کے بھی تمام مصنفین اس میں نظر آتے ہیں۔ پبلشر نے جس محنت سے اس فہرست کو مرتب کیا ہے اسکی داد نہ دینا ظلم ہے۔

لالہ رخ دوسرا اڈیشن ہے جسے کتب خانہ علم و ادب دہلی نے شایع کیا ہے اور نہایت عمدہ طباعت و کتابت کے ساتھ مصوّر و مجلد شایع کیا ہے۔

جناب لطیف اکبرآبادی کی اس کتاب سے قارئین نگار اچھی طرح واقف ہیں اس لئے کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ قیمت دو روپیہ ہے۔

اتاترک غازی مصطفےٰ کمال اتاترک کی سیرت پر اردو میں سب سے آخرین کتاب ہے جس میں عصمت انونو جانشین اتاترک کے بھی مختصر حالات، درج کردئے گئے ہیں۔ اتاترک دنیا کی ان مخصوص ہستیوں میں سے تھا جس پر ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھا جائے گا اور دنیا مختلف حیثیتوں سے اسے یاد رکھے گی۔ یہ کتاب جناب محمد مرزا دہلوی کی تالیف ہے اور باوجود مختصر ہونے کے بہت جامع ہے، اس بطل اعظم کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو ترک کردیا گیا ہو۔ فاضل مولف نے کافی محنت و کاوش سے اس کو مرتب کیا ہے اور زبان و انداز بیان بہت شگفتہ ہے۔ متعدد تصاویر بھی شامل ہیں اور طباعت و کتابت بہت پسندیدہ ہے۔ قیمت دو روپیہ اور ملنے کا پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی۔

پھول والوں کی سیر اس رسالہ میں مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے دکھایا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے زمانہ میں "پھول والوں کی سیر" کیا معنی رکھتی تھی۔ یہ دہلی کا مشہور میلہ ہے جو اب بھی شاید ہوتا ہے لیکن شاہان دہلی کے زمانہ میں تو وہ ایک مستقل رنگینی تھا، جس کے اظہار کے لئے مرزا فرحت اللہ بیگ ہی کی ٹکسالی زبان کی ضرورت تھی۔ قیمت ۶ر

ہندوستان کی صنعت و تجارت تصنیف ہے جناب منت اللہ صاحب رحمانی ام۔ ال۔ اے کی جس میں انھوں نے پہلے نہایت محنت و کاوش سے یہاں کی صنعت و تجارت پر روشنی ڈالی ہے اور پھر یہ بتایا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے اسے کتنا نقصان پہونچا اور انگریزوں نے کس کس طرح اس کو تباہ و برباد کیا۔

ہماری سیاسی تربیت کے لئے ایسی کتابوں کا مطالعہ ازبس ضروری ہے اور ملک کو فاضل مصنف کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اس خدمت کو بوجہ احسن انجام دیا۔ اس کی قیمت ۱۲ر ہے اور ملنے کا پتہ مکتبہ اسلفیہ۔ مونگیر (بہار)

بعض نئے رسائل و جرائد اس دوران میں لکھنؤ کی شیعہ سنی نزاع نے اتنے اور ایسے عجیب و غریب

رسایل و اخبار یہاں کی سرزمین سے پیدا کئے کہ لاہور بھی شکست کھا گیا، لیکن حشرات الارض کی طرح پیدا ہوئے تھے اور آخر کار انھیں کی طرح فنا ہو گئے۔ لیکن اسی زمانہ میں بعض ایسے پرچے بھی رونما ہوئے جنکا ذکر ضروری ہے

یہاں کے ہفتہ وار اخباروں میں صداقت و پرچم کا اضافہ ہوا ہے۔ صداقت کی پالیسی وہی ہے جو حقیقت کی لیکن پرچم سوشلسٹ جماعت کا پرچہ ہے اور اپنی خصوصیات کے لحاظ سے شاید ہندوستان کا ایک ہی پرچہ ہے مدیر سبط حسن صاحب ہیں اور ان کے دست و بازو جناب مجاز و علی سردار جعفری ہیں۔ ان تینوں پرجوش نوجوانوں نے جس ولولۂ عمل کے ساتھ اس کو جاری کیا وہ ہر طرح مستحق ستایش ہے اور ملک کو اس کی قدر کرنا چاہئے انھیں لوگوں نے نیا ادب کے نام سے ایک ماہنامہ بھی جاری کیا ہے جو اس دور کے ترقی پسند مصنفین کے بہترین افکار پیش کرتا رہتا ہے۔ پرچم اور نیا ادب میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ باوجود سادگی کے اپنے اندر خاص روح رکھتی ہے اور میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ملک میں لٹریچر کا جو یہ نیا دور شروع ہوا ہے وہ بہت جلد اپنی جگہ پیدا کرلے گا۔

یوپی کی حکومت کی طرف سے کاشتکاروں کیلئے ایک ماہانہ پرچہ ہل کے نام سے جاری ہوا ہے، جو انڈین پریس الہ آباد سے شایع ہوتا ہے اور اپنی ترتیب، اپنے مضامین اور اپنی تصاویر کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ نہ صرف کاشتکار بلکہ ہر شخص کے مطالعہ میں آئے۔

مفید و دلکش نظمیں، پر از معلومات مقالے، کار آمد افسانے، تمدنی مسایل، صناعتی و تجارتی نکتے، سبھی کچھ اس میں ہوتا ہے اور جو کچھ ہوتا ہے نہایت سلیقہ سے پیش کیا جاتا ہے۔

بالکل اسی قسم کا ایک رسالہ "ہونہار" پٹنہ سے بھی شایع ہوتا ہے اور گو اس کی ضخامت ہل سے کم ہوتی ہے، لیکن اور تمام حیثیتوں سے وہ کسی طرح اس سے کم نہیں ہے۔ اس قسم کے رسایل و جراید کا شایع ہونا ملک کی ذہنی ترقی کا ثبوت ہے اور اہل ملک کا فرض ہے کہ ان کی قدر کریں۔

ایک اور ہفتہ وار یہاں سے شایع ہوتا ہے جس کا نام ہندوستان ہے، یہ کانگرسی اُصول کا حامی ہے اور نہایت خوبی سے اپنے فرایض انجام دے رہا ہے۔

"پیام نسواں" لکھنؤ

ہندوستانی خواتین کا ایک ترقی پسند ماہوار رسالہ۔ جس میں ہندوستان کی مشہور خواتین اور ادیبوں کے اعلیٰ علمی و ادبی مقالے۔ اخلاقی و معاشرتی افسانے۔ مزاحیہ مضامین روح نواز نظمیں۔ نجوم و قیافہ کی دلچسپیاں۔ طبی معلومات اور کشیدہ کاری کے خوبصورت نمونے اور گھرستی زندگی کے مسایل پر اہم بحثیں شایع ہوتی ہیں۔

پیام نسواں

رابعہ بیگم نگار اور شمیم آرا بیگم نجمہ کی ادارت میں ہر ماہ کی ۵ تاریخ کو پابندی کے ساتھ شایع ہوتا ہے۔ کتابت خوبصورت۔ طباعت دلفریب کاغذ سفید چکنا۔ سالانہ چندہ دو روپیہ۔ نمونہ مفت

منیجر پیام نسواں۔ حلقۂ اشاعت لکھنؤ

شاعر اور پپیہا

خاموش او پپیہے، دل میرا جل رہا ہے
میری رگوں میں تیرا نغمہ مچل رہا ہے

آواز تیری ایسی پُر درد ہو رہی ہے
جیسے کہ کوئی حسرت سینے میں سو رہی ہے

شاخیں لچک رہی ہیں، گلشن مہک رہے ہیں
بدمست وادیوں میں جھونکے بہک رہے ہیں

اٹھلا رہے ہیں بادل سوئی ہوئی فضا میں
ہلکی سی راگنی کی آواز ہے ہوا میں

نوخیز پتیوں سے بوندیں ٹپک رہی ہیں
سرسبز ساحلوں کی آنکھیں جھپک رہی ہیں

کلیاں چٹک رہی ہیں، مدہوش ہیں ہوائیں
چبھتی ہیں درد بنکر دل میں تری صدائیں

بوندیں پہاڑیوں پر چھاگل بجا رہی ہیں
کالی گھٹائیں تجھ پر آنسو بہا رہی ہیں

تو "پی کہاں" کا نغمہ جس دم الاپتا ہے
ابرِ سیہ کے اندر خورشید کانپتا ہے

گلشن میں تیرا نغمہ اک ساز بن گیا ہے
تو دل کے ٹوٹنے کی آواز بن گیا ہے

باغوں میں زندگی تو اپنی گزارتا ہے،
برکھا کے مست جوگی ؟ کس کو پکارتا ہے؟

کیا نخلِ زندگانی تیرا اُجڑ گیا ہے،
کیا "پی" ترا پپیہے! تجھ سے بچھڑ گیا ہے؟

کیا سوزشِ محبت تجھ کو رُلا رہی ہے
اپنے پیا کی تجھ کو کیا یاد آرہی ہے؟

کیوں ہل گئے یکایک شاخوں پہ تیرے شہپر
کیا دیکھتا ہے مجھکو تو پتیوں سے جھک کر

مجھ غم نصیب کو کیا تو جانتا نہیں ہے
میں ہمنوا ہوں تیرا پہچانتا نہیں ہے؟

اُجڑے ہوئے دلوں میں اک سرد آہ بھرلیں
آ، دونوں اپنے اپنے پیتم کو یاد کرلیں

شرف احمد خاں سروش ملیح آبادی

آہنگِ نشاط

روٹھی ہوئی خوشی کو مناۓ ہوۓ ہوں میں
گھی کے چراغ دل میں جلاۓ ہوۓ ہوں میں

حسرت، جو کل تھی، آج نگاہوں کا بار ہے
ہر سمت اک چمن سا کھلاۓ ہوۓ ہوں میں

محوِ خرامِ ناز ہے، بانوۓ شہرِ حسن
فرشِ زمیں پہ آنکھیں بچھاۓ ہوۓ ہوں میں

مدت سے میں تھا، تشنۂ نظارۂ حبیب
جی بھر کے آج پیاس بجھاۓ ہوۓ ہوں میں

رہ رہ کے گھورتے ہیں مجھے ماہ و مشتری
مہر و وفا کو گھر میں چھپاۓ ہوۓ ہوں میں

ذوقِ نگاہ، آج ہے کس درجہ کامیاب
آنکھیں تجلیوں سے لڑاۓ ہوۓ ہوں میں

فصلِ بہار، خود مری حلقہ بگوش ہے
جنت کے پھول گھر میں کھلاۓ ہوۓ ہوں میں

مہکا ہوا ہے، ہر در و دیوار آج کل،
عطرِ وفا سے گھر کو بساۓ ہوۓ ہوں میں

رخ پر نظر ہے، باہوں میں باہیں ہیں، دل میں دل
سو حشر ایک ساتھ اٹھاۓ ہوۓ ہوں میں،

برسوں مرے غموں کا اڑایا گیا مذاق،
اب بے حسوں کی نیند اڑاۓ ہوۓ ہوں میں

ہے سوچ میں فلک تو زمیں دم بخود سی ہے
دونوں جہاں کو سر پہ اٹھاۓ ہوۓ ہوں میں

کس کی مجال ہے کہ چلے چال اب کوئی
بازیٔ حسن و عشق جماۓ ہوۓ ہوں میں،

ہر نظم، ہر نظام ہے، قابوۓ عشق میں،
کتنا بلند دل کو اٹھاۓ ہوۓ ہوں میں،

ٹھہرا ہوا ہے وقت، زمانہ رکا ہوا
مٹھی میں روز و شب کو دباۓ ہوۓ ہوں میں،

سہما ہوا ہے ہوش بھی زعمِ نشاط سے
ہر سمت دامِ عشق بچھاۓ ہوۓ ہوں میں

ہے محوِ دل سے، اب بے سرو سامانیٔ حیات
لاکھوں غموں کو ہنس کے بھلاۓ ہوۓ ہوں میں

ماضی کے غم پہ اب ہیں مرے فقرہ ہاۓ چست
اپنے فریب آپ ہی کھاۓ ہوۓ ہوں میں

فطرت واسطی

طلسمِ خیال

(ایک بچہ کو "کھلونا محل" بناتے ہوئے دیکھکر)

بنتے ہیں کارگاہِ تخیل میں صبح و شام
آہن گداز عزم، فلک رس پروگرام
ہر بحر کے خروش کا خلاق ہے خیال
ہر اضطراب و جوش کا خلاق ہے خیال
ہوش! ایک اصطلاع ہے فکرِ مآل کی
کیف! ایک شاہراہِ حسیں ہے خیال کی
مہتاب و کہکشاں کے معانی کا اعتبار
شب تابیٔ نجوم کا اندازِ زرنگار
امنِ سکوں رُبا کے اشارات کا فسوں
عشقِ بلا نواز کا کیمیائے جنوں،
پروانۂ نحیف کی جلتی ہوئی جبیں،
شمعِ خموش لب کا تقاضائے آتشیں
ہیں دائرے تمام طلسمِ خیال کے
حلقے ہیں اک حسین و دل آویز جال کے
ہے فلسفہ خیال کے چہرے کا اِک حجاب
حیرت کا اک چمکتا ہوا، سیم گوں سحاب
ذوقِ گناہ ایک شگفتہ خیال ہے
زہد اِک جواں خیال کا رنگِ زوال ہے
یزدان و اہرمن کے جسد کی حرارتیں
ہیں شوخیٔ خیال کی رنگیں جسارتیں،
دیر و حرم ضعیف سے دو اعتبار ہیں
کون و مکاں گماں کی فضا کا غبار ہیں،
تعمیر و ریخت ایک جنوں ہے حیات کا
نا مختتم ہے سلسلہ اِن واقعات کا
ننھا سا تیرا ذہن ہے اور اُس میں یہ اُبال
لے جائزہ خیال کا، اِک اور قصر ڈھال
لیکن تری حیات کے ایواں میں اے عزیز
موجود ہو ذرا سی مرے میکدہ کی چیز
ہو فلسفے کے قصر میں اک بابِ شعریت
اک عزمِ آہنی ہے مرا خوابِ شعریت
ہے شاعری خیال کا اِک سجدۂ نیاز
اس گیت نے سمیٹ لیا سب متاعِ ساز

دستِ عمل پہ شعر کا سایہ بھی چاہئے
تفصیل کی جبیں پہ کنایہ بھی چاہئے

عدم

جبرئیل وابلیس کی جنگ

کہا ہے مجھ سے یہ ابلیس نے بزعم وقار — کہ اس نے توڑ دی جبریل کی کمندِ قرار
کہا تھا اُس نے یہ جبریل سے کہ اے جبریل! — بلند تر مہ و پرویں سے ہے تری فہم جمیل
دلے خبر نہیں تجھ کو ترا مقام ہے کیا — خودی کا ساز ہے کیا، اسکا انصرام ہے کیا
میں چاہتا ہوں کہوں تجھ سے ہست و بود کا راز — جہاں میں صرف خودی ہے مگر وجود کا راز
اسی خودی سے ہوا ہوں میں صاحبِ اشراق — اسی خودی نے کیا مجھکو محرمِ اعماق
جہانِ ذکر کے اندر ہے گم تری آواز — خدا کے ساز کی ہم ساز ہے مری آواز
مقامِ غور ہے ہستی کا درس لے جبریل — اسیرِ دامِ غلامی تری متاعِ جمیل!
یہ سن کے اُٹھ گئی جبریل کی نگاہ کبود — لرزتے کانپتے اس نے کہا کہ اے "مردود!"
"خموش کر دوں ابھی شمعِ گمرہی افروز — سیاہ کر دوں ابھی تیرا نطقِ عصمت سوز"
یہ سن کے ہو گیا ابلیس تند شعلۂ ناب — اِدھر سے نیزہ اُدھر سے اُٹھا عصائے شہاب
سرِ بہشت ہوئی ایسی جنگ آتش ناک — کہ عرش ہلنے لگا تھر تھرا گئے افلاک

کاوش حیدرآبادی

حسین کشیدہ کاری

عورتوں کا سلیقہ اور بچیوں کی ہنرمندی دیکھنا ہو تو ان کے گھروں میں جا کر کشیدہ کاری کے نمونے دیکھئے۔ خوشنما نمونے خوش مذاقی اور سلیقہ کی شہادت دیں گے اور بدنما نمونے بدمزاقی اور پھوہڑپن کا پتہ دیں گے۔ آپ اپنی لڑکیوں کو کیا بنانا چاہتے ہیں۔ ہنرمند یا بے ہنر؟ اگر ہنرمند بنانا ہے تو آج ہی نواب ذکیہ سلطانہ کی مشہور کتاب حسین کشیدہ کاری منگا کر گھر میں رکھئے اور اس سے فایدہ اُٹھائیے۔

اس کتاب میں خوشنما کٹاؤ دار گریبان۔ گھر۔ کف۔ میز پوش۔ پلنگ پوش۔ رومال۔ غلاف۔ دوپٹوں۔ کتبوں۔ اور سیکڑوں قسم کے حسین و خوبصورت پھول۔ ڈیزاین اور بیلیں تیار کرنے کے اعلیٰ نمونے درج ہیں۔

لکھنؤ کی ہر خوش مذاق لڑکی حسین کشیدہ کاری کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ آپ بھی اس کتاب کو خرید کر اپنی لڑکیوں اور بیویوں کو دیجئے۔

رعایتی قیمت بارہ آنہ (ٹکٹ بھیج کر ہم سے فوراً منگائیے) وی پی میں چھ آنہ زیادہ صرف ہوں گے۔

منیجر حلقۂ اشاعت۔ زنبور خانہ - لکھنؤ

غزلیات

فراقؔ گورکھپوری

یہ نہیں ہوتی تھی حالت جانبِ در دیکھ کر
آستانِ یار سے ہم آج اُٹھ جائیں گے کیا

حسن بے پایاں سہی اس درجہ کیوں مایوس ہوں
عشق اک زنداں سہی اتنا بھی گھبرائیں گے کیا

اب صدائے خلق کا انداز بھی مانوس ہے
لوگ کچھ ہم تک ہماری بھی خبر لائیں گے کیا

یہ تبسم یہ تکلم یہ اشاراتِ نہاں
ہم نگاہ ناز کی باتوں میں آجائیں گے کیا

چھوٹتا ہے اُن کا در - ہوں اک نظر کا منتظر
ایسے میں بھی کچھ تامل سا وہ فرمائیں گے کیا

عشق کی باتیں سمجھنے کی نہ سمجھانے کی ہیں،
سب بجا شرح و بیاں ہم ان کو سمجھائیں گے کیا

اپنے تسلیم و رضا پر شرم سی آنے لگی
ہم نیازِ عشق کی حد سے بھی بڑھ جائیں گے کیا

اُنگلیاں اُٹھیں زمانے کی نگاہیں بھی اُٹھیں
دیکھنے والے تری آنکھوں کے شرمائیں گے کیا

دل کی ہیں آبادیاں بیتابیاں، ہیں عشق کی
اس جگہ بھی دربدر کی ٹھوکریں کھائیں گے کیا

سنتے آئے ہیں حسابِ دوستاں در دل فراقؔ
کاروبارِ عشق میں کھوئیں گے کیا پائیں گے کیا

انجم رضوانی :-

اک نورِ مجسم سامنے ہے ترکیبِ ضیا کو دیکھتا ہوں
بندے کے جمالی پیکر میں انوارِ خدا کو دیکھتا ہوں

میں آہ کروں تاثیر نہ ہو! میں روؤں اور طوفاں نہ اُٹھے!
کچھ روز ابھی خاموش ہوں میں، کچھ اور خدا کو دیکھتا ہوں

مانگا نہیں اور بخشا تو نے، یہ لطف ترا یہ شان تری
میں اپنی خطا پر نادم ہوں اور تیری عطا کو دیکھتا ہوں

احباب نہ محوِ حیرت ہوں بے وجہ سکوت نہیں میرا
دُنیا کو اُٹھنے سے پہلے میں اُنکی رضا کو دیکھتا ہوں

اُٹھتی ہے نگاہِ بے پروا اب خیر نہیں رضوانیؔ کی
بیباک نظر کی جنبش میں بیرحم قضا کو دیکھتا ہوں